آپ بیتی

سلیوٹ

صدیق سالک

سلیوٹ

(آپ بیتی)

صدیق سالک

نکلے تیری تلاش میں

میرا جسم فوجی وضع کا ہے اور ذہن غیر فوجی ساخت کا' اس کے باوجود پچھلے پچیس برس سے فوج میں نوکری کر رہا ہوں' کمال میرا نہیں' فوج کا ہے ورنہ محض جسم کے رشتے اتنے دیر پا نہیں ہوتے۔

میں ایک بنجر اور بارانی علاقے میں پیدا ہوا۔ جہاں صرف فوجی اگتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں جو اگتے تھے' توپوں کا چارہ بننے کے لئے دساور کو بھیجے جاتے تھے۔ اب جو پلتے بڑھتے ہیں اپنے ملک کی دفاعی فصیل میں سجائے جاتے ہیں۔ میں نے اسی فوجی ماحول میں آنکھ کھولی۔ میری ابتدائی یادداشتوں میں یہ بات محفوظ ہے کہ ہمارے گاؤں کے اکثر سجیلے جوان تخت برطانیہ کے تحفظ کی خاطر جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑنے گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی بھیجی ہوئی ماہوار ہر مہینے باقاعدگی سے ان کے اہل وعیال کو ملتی رہتی تھی' ہم طلباء ایک سماجی فریضے کے طور پر ان سورماؤں کے اپنی ماؤں' بہنوں اور بیویوں کے نام خط پڑھتے اور ان کے جواب لکھتے تھے۔ اگر کبھی خط کی بجائے تار آجاتا تھا' تو سارے گاؤں میں کہرام مچ جاتا تھا کہ پتہ نہیں کس گھر کا چراغ گل ہو گیا ہے۔ تار کو یقیناً بد شگونی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

ان دنوں تار پڑھنے والے بھی بہت کم ہوتے تھے لہٰذا جب تک تار پڑھوا نہ لیا جاتا' سارا گاؤں ماتم کدہ بن جاتا تھا۔ میٹرک میں میرے اول آنے پر ایک دوست کی طرف سے مبارکباد کا تار آیا تو ہمارے گھر میں بھی کچھ اسی قسم کا سماں بندھ گیا لیکن خوش قسمتی سے میں اس وقت تک تار پڑھنے کے قابل ہو گیا تھا (پتہ نہیں آج کے میٹرک پاس کیا پڑھتے ہیں)

میں جس نیم کاشتکارانہ' نیم سپاہیانہ اور نیم خواندہ ماحول میں پیدا ہوا اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں ابتدائی جماعتوں میں کسی مناسب سطح پر فیل ہو کر فوج میں چلا جاتا اور ایک فوجی کوزہ گر کے ہاتھوں ایک روایتی کوزے میں ڈھل کر فوج کے جسم وجان میں تحلیل ہو جاتا' لیکن میں نے میٹرک ہی نہیں ایم اے (انگریزی) کر ڈالا پھر بین الاقوامی تعلقات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر ڈالی اور اس طرح میرا ذہن جاگ اٹھا اور جسم سو گیا۔

اتنی فالتو جماعتیں پڑھنے کے بعد میں فوج کے قابل نہ رہا لیکن گاؤں والوں کی خواہش تھی کہ میں فوج میں صوبیدار ہو جاؤں کیوں کہ پچھلی کئی نسلوں سے ہمارے گاؤں سے کوئی شخص صوبیداری کے عہدے تک نہیں پہنچا تھا' ہزاروں لوگ انگریز کی نوکری کے

لئے جاتے تھے وہ یا تو دیارِ غیر میں دادِ شجاعت دے کر وہیں کہیں دفن ہو جاتے تھے یا دس پندرہ روپے ماہوار پنشن پا کر واپس گاؤں آجاتے تھے۔ ان میں سے چند ایک اچھے کھلاڑی واقع ہوئے تھے لانس نائیک اور حوالدار ہو گئے تھے لیکن کسی کے کندھے پر پھول نہیں چمکے تھے۔ لہٰذا سارے گاؤں خاص کر چاچا احمد خان کی نظریں مجھ پر تھیں کہ میں علم کے زور پر ضرور جمعدار یا صوبیدار ہو جاؤں گا۔ میں جب بھی ایف اے بی اے یا ایم اے کا امتحان دے کر گاؤں آتا تھا تو چاچا احمد خان مجھے یہی مشورہ دیا کرتا تھا کہ ''پتر بس کر اتنی جماعتوں سے بھی جمعدار ہو سکتا ہے بس کر فالتو جماعتیں نہ پڑھ۔''

ہمارے گاؤں میں ایک بابا رمضان ہوتا تھا جس کا محبوب مشغلہ مقدمہ بازی تھا اول تو گاؤں کا کوئی نہ کوئی شخص اس پر کوئی نہ کوئی دعویٰ دائر کر دیتا تھا اور اگر کسی کو ایسی توفیق نہ ہوتی تو وہ خود کسی پر مقدمہ چلوا دیتا تھا۔ اس کے مقدمے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے مثلاً فلاں شخص نے میری زمین زبردستی کاشت کر لی ہے یا فلاں شخص نے میرا بیل چوری کر لیا ہے یا فلاں شخص نے میرے کھیت سے درخت کاٹ لیا ہے وغیرہ۔ مقدمے کی نوعیت کتنی ہی خفیف سہی لیکن وہ بڑی شدت سے اس کی پیروی کرتے تھے اور گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ کسی کو قید کروانے یا چھڑانے کے جملہ اسرار و رموز پر پوری گرفت رکھتے ہیں۔ انہی معرکوں میں ان کا واسطہ اکثر و بیشتر تھانے کچہری کے اہلکاروں سے پڑتا رہتا تھا لہٰذا بابا رمضان کی دلی خواہش تھی کہ میں کسی طرح تھانیدار یا تحصیلدار بن جاؤں اور اپنے تھانے یا تحصیل (کھاریاں) میں لگ جاؤں ایک دن میں نے بابا رمضان سے پوچھا کہ میرے تھانیدار یا تحصیلدار بننے سے اسے کیا فائدہ ہوگا اس نے کہا۔ ''میرا بھتیجا اتنا بڑا افسر ہو جائے تو میں گاؤں میں اپنے سارے مخالفوں کو ہتھکڑیاں لگوا دوں۔ مزا آجائے گا؟''

میں صوبیدار بن سکا نہ تھانیدار اور نہ تحصیلدار بلکہ لیکچرار لگ گیا اور وہ بھی فیصل آباد (ان دنوں لائل پور) میں میں ایک مرتبہ گاؤں آیا تو عصر کی نماز کے بعد بابا رمضان مجھے مسجد کی سیڑھیوں کے پاس مل گیا اس نے جھک کر اپنی تنگ جوتی کی ایڑھی میں انگلی ڈال کر اسے پہنا اور سیدھا ہو کر مجھے کہنے لگا۔ ''پتر کچھ روزگار کا بندوبست ہو گیا ہے یا ابھی تک منڈھے (لڑکے) ہی پڑھا رہے ہو'' عرض کیا ''ابھی تک منڈھے ہی پڑھا رہا ہوں۔'' کہنے لگا ''اس کام کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی ساتھ ہی تو پرائمری سکول ہے۔ یہ شوق یہیں پورا کر لیتے۔'' اس کے بعد میں نے گاؤں جانا کم کر دیا۔

ان دنوں میں اپنے ایک استاد پروفیسر حمید احمد خاں کے زیرِ اثر تھا جو کہا کرتے تھے کہ افسری کے پیچھے دوڑنا اعلیٰ انسانوں کا شیوہ نہیں۔ بقول ان کے صرف بھوکے کتے سر جھکائے دم دبائے ہڈیوں کی تلاش میں گلیوں کا کوڑا کرکٹ سونگھتے پھرتے ہیں شاہین کی

نظر ہمیشہ بلند ہوتی ہے۔ وہ بھوکا بھی ہو تو مردار پر نہیں جھکتا۔ وہ فرمایا کرتے تھے۔ انسان کی عظمت عہدے میں نہیں اس کے علم میں ہوتی ہے لہٰذا علم پڑھو، علم پڑھاؤ سر بلند رہو، کسی ہڈی کے لئے سر مت جھکاؤ۔ ان کے وعظ کا دوسرا حصہ یہ ہوتا تھا کہ اگر انسان کا بنیادی مقصد حصول مسرت ہے تو مسرت کے سرچشمے انسان کے باہر نہیں اس کے اندر ہوتے ہیں وہ کہا کرتے تھے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا عہدہ تمہیں خوشی نہیں دے سکتا۔ تاوقتیکہ خوشی کے سرچشمے تمہارے اندر سے نہ پھوٹیں، بقول ان کے جو خوشی ایک اعلیٰ ناول، ایک عمدہ نظم یا ایک اچھی غزل پڑھ کر۔ یا لکھ کر۔ حاصل ہو سکتی ہے، وہ اعلیٰ عہدہ دار بن کر نہیں ہو سکتی۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ شعبہ انگریزی کے سربراہ سے ترقی پا کر کالج کے پرنسپل بنے تو ہم چند طلباء انہیں مبارکباد دینے گئے۔ انہوں نے اشک بار آنکھوں سے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''مبارک کس بات کی؟ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ دو سو روپے کے عوض میرے ہاتھ میں لٹھ تھما دیا گیا ہے کہ کالج کی تھانیداری کرو، اس کے عوض تمہیں کچھ خبر ہے، مجھ سے کیا لے لیا گیا ہے، مجھے کتابوں سے دور کر دیا گیا ہے۔ اب میں سکون سے اپنی کرسی پر بیٹھ کر یا اپنے بستر میں لیٹ کر اپنی مرضی کا ناول، نظم یا غزل نہیں پڑھ سکتا، میری خوشی کے سرچشمے مجھ سے چھین لئے گئے ہیں۔ مجھے محروم نشاط کر دیا گیا ہے اور تم ہو کہ مجھے مبارکباد دینے آئے ہو۔ کس بات کی مبارکباد؟۔'' ہم اپنا سا منہ اور بیگانی جھاڑ لے کر واپس آ گئے۔

میں نے ان کی نصیحت پلے باندھی اور درس و تدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ ہمارے ساتھی سول سروس اور فارن سروس حتیٰ کہ پولیس سروس اور کسٹم سروس کے چکر میں پڑ گئے۔ میں اپنے استاد کی دی ہوئی لاٹھی کے سہارے پہاڑوں پر چڑھ گیا یعنی گورنمنٹ کالج مانسہرہ (ضلع ہزارہ) میں انگریزی کا لیکچرار ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے کو اپنا شعار بنایا اور خوشی کے سرچشمے اپنے اندر تلاش کرنے لگا۔

اس کے باوجود گاؤں سے میں اپنا رشتہ نہ توڑ سکا۔ جاتا ضرور تھا، لیکن چاچا احمد خاں اور بابا رمضان سے بچ کر رہتا تھا کہ کہیں سامنا ہو گیا تو کیا جواب دوں گا۔ ایک دفعہ پھر مسجد سے نکلتے ہوئے ناچار بابا رمضان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال پوچھتے میں نے انہیں کہا ''بابا اب میری نوکری پکی ہو گئی ہے۔ پہلے میں اسلامیہ کالج لائل پور میں تھا اب گورنمنٹ کالج مانسہرہ میں چلا گیا ہوں۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا ''پتر افسری کتنی دور ہے'' عرض کیا ''میں افسر بن گیا ہوں۔ لیکچرار گزٹیڈ افسر کلاس ٹو ہوتا ہے۔'' اس کی سمجھ کچھ نہ آیا اس نے کہا ''پتر تھانیدار یا تحصیلدار نہیں بن سکتا تو پٹواری یا گرداور ہی بن جا، ان کی بھی بڑی پاور ہوتی ہے۔'' میں نے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا۔ ''اچھا بابا، کوشش کروں گا۔'' اس نے جاتے جاتے کہا ''میری بات یاد رکھنا تمہارے گرداور بننے سے گاؤں کی بھی ٹور (عزت) بن جائیگی۔''

میں نے واپس مانسہرہ آ کر پروفیسر حمید احمد خاں کی پلے باندھی ہوئی نصیحت کو کھولا' اسے از سر نو پرکھا چاچا احمد خاں اور بابا رمضان کی نصیحتوں سے اس کا موازنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سادہ لوح دیہاتی مجھے کرگس بنانے کے درپے ہیں جب کہ میرا پسندیدہ پروفیسر مجھے شاہین دیکھنا چاہتا ہے۔علم کا شاہین! چنانچہ میں نے پروفیسر حمید احمد خاں کی بات کو فوقیت دی اور اپنی زندگی علم و ادب کے لئے وقف کرنے کے فیصلے پر ڈٹا رہا۔اسی فیصلے کے تحت میں نے پی۔ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا' ذاتی لائبریری کے لئے ہر مہینے چند کتابیں خریدنے کا بجٹ بنایا۔اپنے اوقات کا کو یوں تقسیم کیا روزانہ کم از کم چار پانچ گھنٹے ذاتی مطالعے کے لئےمل جائیں۔اسی دھن میں' میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ کبھی شادی نہیں کروں گا کیونکہ اگر مسرتوں کا سرچشمہ کتابیں ہیں تو بیوی بچوں کا جھنجھٹ پالنے کی کیا ضرورت ہے۔آئندہ نسلوں کے لئے اپنا نام ہی چھوڑنا ہے تو تصنیف و تالیف کے ذریعے کیوں نہ چھوڑا جائے' اولاد تو ناخلف بھی ہو سکتی ہے' کتابیں تو ناخلف نہیں ہوسکتیں؟

چنانچہ میں نے مانسہرہ شہر کے مغربی کنارے پر لوہار بھانڈے میں ایک اونچا سا مکان کرائے پر لے لیا اور اس میں شاہین کی طرح زندگی گزارنے لگا۔بیس روپے ماہوار پر ایک ملازم رکھ لیا اور شیشے کے چار گلاس (جگ سمیت) خرید لئے' ایک ٹی سیٹ ادھار لیا کہ اگلی تنخواہ پر قیمت ادا کر دوں گا۔اپنے پاس ایک چارپائی اور بستر تو تھا ہی' ایک فالتو چارپائی آنے جانے والے مہمان کے لیے خرید کر رکھ لی۔

لائبریریوں کے چکر لگانے لگا۔لاہور میں پرانے دوستوں اور اساتذہ کے ذریعے کتابیں منگوانے لگا۔رفقائے کار ٹیوشن پڑھانے چلے جاتے تو میں مطالعے میں کھو جاتا۔

لائبریریوں کے چکر لگانے لگا۔لاہور میں پرانے دوستوں اور اساتذہ کے ذریعے کتابیں منگوانے لگا۔رفقائے کار ٹیوشن پڑھانے چلے جاتے تو میں مطالعے میں کھو جاتا۔

کچھ ہی عرصے بعد مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ انسان صرف کتابوں کی محفل میں زندہ نہیں رہ سکتا یہ ایک سماجی جانور (Social Animal) ہے' جسے اپنے جبلی تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ تعلق برقرار رکھنا پڑتا ہے' چنانچہ میں نے شام کو مقامی کلب میں ٹینس کھیلنا شروع کر دیا' انہی دنوں اتفاق سے میرا ایک کلاس فیلو سی ایس پی ہو کر مانسہرہ کا اسسٹنٹ کمشنر ہو گیا' وہ بلحاظ عہدہ کلب کا پریذیڈنٹ بن گیا' میں خوش کہ ہمارا ہم جماعت صدر بن گیا ہے' ان کے ساتھ مقامی Gentry میں ڈاکٹر' جج' وکیل اور مجسٹریٹ سے بھی تعارف ہوا' چند دن تو تکلف میں ٹھیک ٹھاک گزرے' لیکن جلد ہی مجھے احساس دلایا گیا کہ وہ تو

معاشرے میں سرکردہ حیثیت رکھتے ہیں' لیکچرار تو محض سکول ماسٹر ہے' جس کی اپنی کلاس میں وقعت ہو تو ہو' باہر اس کی کوئی قدر نہیں۔ انسان موچی' درزی اور حجام کا تو شکر گزار ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے جوتے' کپڑے یا سر کو خوش شکل بنائے لیکن استاد جو انسانی کردار کو تشکیل دیتا ہے کسی احترام کا مستحق نہیں۔ مجھے چار سال کے عرصے میں اتنے کچوکے لگے کہ میرے ذہن میں پروفیسر حمید احمد خاں کا تیار کردہ شیش محل ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

میں نے ایک ایسے جزیرے کی تلاش شروع کر دی جہاں میں اپنے استاد محترم کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کر سکوں۔ میں نے اسی جزیرے کی تلاش میں شعبہ تعلیم کو خیر باد کہہ کر پیشہ صحافت اپنایا' وہاں صورت حال کو دگرگوں پایا تو وزارت اطلاعات و نشریات کی غلام گردشوں میں چلا گیا وہاں بیوروکریسی کے ہتھکنڈے دیکھے تو مزید ازردہ ہوا۔ میں پاکستان کے کونے میں اپنے خوابوں کا جزیرہ تلاش کرتا رہا جہاں میں سماجی تیر و نشتر سے محفوظ صرف پڑھنے لکھنے میں مصروف رہ سکوں لیکن مجھے کہیں بھی ایسا گوشہ نصیب نہ ہوا۔

زندگی کے پانچ قیمتی سال ضائع کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چچا احمد خاں اور بابا رمضان ٹھیک ہی کہتے تھے افسر بن جاؤ' صوبیدار نہیں تو تحصیلدار بن جاؤ' تحصیلدار نہیں تو گرداور یا پٹواری ہی بن جاؤ' تمہاری زندگی بھی سکون سے گزرے گی اور گاؤں کی بھی ٹور (عزت) ہوگی میں نے افسری کی تلاش میں بالآخر فوج کے دروازے پر دستک دی' پروفیسر حمید احمد خاں ہار گئے' چچا احمد خاں اور بابا رمضان جیت گئے۔

◆◆◆

چلتے ہو تو فوج کو چلیے

افواج پاکستان نے مجھے اپنی طرف کھینچنے کے لئے جو اشتہار دیا وہ خاصا اشتہا انگیز تھا' اس میں کہا گیا تھا کہ ہم آتے ہی آپ کو کپتان بنا دیں گے' معقول مشاہرہ دیں گے' رہنے کو بنگلہ عنایت کریں گے اور اگر نصیب دشمنان آپ بیمار پڑھ گئے تو آپ کا مفت علاج کریں گے۔ یہ سارے لالچ اپنی جگہ درست تھے لیکن یہ کہیں درج نہ تھا کہ اگر آپ کو پروفیسر حمید احمد خاں کا بتایا ہوا جزیرہ کہیں نہیں ملا تو آیئے ہمارے پاس تشریف لایئے' ہم آپ متبادل جزیرہ دکھائیں گے' شاید آپ کو پسند آجائے۔

میں نے افواج پاکستان کی دعوت قبول کر لی اور ایک عدد درخواست داغ دی' جی ایچ کیو سے فوراً بلاوا آگیا۔ حاضر ہوا تو سب سے پہلے انہوں نے میری ذہانت پر شک کیا اور کہا۔ ہم تمہارا Intelligence test لیں گے' پہلے تو مجھے ناگوار گزرا لیکن کپتانی کے لالچ میں اس ٹیسٹ پر آمادہ ہو گیا جب ہمارے دو پی ایچ ڈی ڈگری والے ساتھی اس ٹیسٹ میں فیل ہو گئے تو احساس ہوا کہ فوج والے سچ تھے' غالباً وہ یہ ٹیسٹ کرنا چاہتے تھے کہ ہمارا معیار ان کے مطلوبہ معیار سے اونچا تو نہیں' جن کا معیار ضرورت سے زیادہ تھا' انہیں شروع ہی میں فارغ کر دیا گیا اور ہم جو اس معیار کے قریب قریب تھے باقی امتحانات کے لئے روک لئے گئے۔ اگلا مرحلہ Aptitude Test کا تھا یعنی میلان طبع کا امتحان' اس ضمن میں انہوں نے غالباً میرے خاندانی' سماجی اور جغرافیائی پس منظر کو خاصی اہمیت دی اور مجھے اس ٹیسٹ میں پاس قرار دے دیا' پھر انہوں نے میری مطبوعہ تحریروں کا جائزہ لیا لیکن ان میں بھی کسی ذہنی تخریب کاری کی کوئی بو نہ آئی۔ اب آخری مرحلہ سلیکشن بورڈ کے سامنے پیشی کا تھا۔ کہتے تھے کہ یہ اعلیٰ سطحی بورڈ ہے حالانکہ مجھے اس میں کوئی چیز سطحی نہیں لگتی تھی' اس کے چیرمین' پاک فوج کے ایڈ جوٹنٹ جنرل' میجر جنرل عتیق الرحمٰن تھے جو ایک دیانتدار اور سخت گیر افسر کی شہرت رکھتے تھے' ان کے ساتھ چار بریگیڈیر بیٹھے تھے اتنے سنیئر افسروں کو اپنے سامنے یکجا دیکھ کر میں یوں چونکا جیسے جنگل میں اچانک شیر دیکھ کر انسان کانپ جاتا ہے مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور آیت الکرسی پڑھ کر سامنے والی کرسی پر تن کر بیٹھ گیا اور دل میں کہا۔ ''پوچھ لو جو کچھ پوچھنا ہے' کر لو جو چھان پھٹک کرنی ہے' بعد میں یہ نہ کہنا کہ مال کھوٹا ہاتھ آگیا ہے۔'' اس سوچ سے (اور آیت الکرسی سے) میرے اندر خاصا اعتماد پیدا ہو گیا۔

بورڈ کے سبھی ارکان بھلے لوگ نکلے' انہوں نے سب سے اچھا کام یہ کیا کہ مجھ سے یہ نہ پوچھا کہ'' آپ فوج میں کیوں آنا چاہتے

ہیں' اور مجھے یہ پتا ہوا جواب نہ دینا پڑے کہ "ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہوں" انہوں نے سیدھے سادھے سوال پوچھے' میں نے سیدھے سادھے جواب دیے اور یوں ایک سیدھا سادا آدمی سیدھے سادھے لوگوں کی صف میں شامل ہوگیا۔ (آپ مسکرا کیوں رہے ہیں)

کوئی چار سو امیدواروں میں صرف میں اور احسان اللہ خان دانش منتخب ہو پائے' باقی ۳۹۸ یہ کہتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے کہ صرف جرنیلوں کے بیٹے یا بھتیجے لئے گئے ہیں ہمیں خواہ مخواہ خانہ پری کے لئے بلایا گیا تھا۔ مجھے اپنا حال تو معلوم تھا میں نے دانش سے پوچھا آپ کس جنرل کے بیٹے یا بھتیجے ہیں' اس نے جواب دیا کہ واحد فوجی جس سے اس کی واقفیت ہے حوالدار انار خان ہے جو ریڈیو پاکستان' پشاور' کا سیکورٹی گارڈ ہے جہاں وہ بطور سکرپٹ رائٹر کام کرتا رہا تھا۔

جب تہمتوں کا موسم تھم گیا اور ہم دونوں کچی پکی کپتانی لگائے افواج پاکستان کے شعبہ تعلقات عامہ میں پہنچ گئے تو دانش نے افسری کی دھوپ تاپتے ہوئے مجھ سے رازداری میں کہا۔ "سالک صاحب یہ بات تو اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ چار سو امیدواروں میں ہم دونوں قابل ترین تھے جنہیں چن لیا گیا۔" عرض کیا "دانش بھائی ذرا آہستہ بولو ورنہ پول کھل جائے گا۔"

"وہ کیسے"

"وہ یوں کہ فوج والوں کو پڑھائی لکھائی کرنے والوں کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں ہوتا' انہوں نے مشہور ادیب مولانا عبدالمجید سالک اور مزدور شاعر جناب احسان دانش کا نام سن رکھا تھا۔ امیدواروں کی فہرست میں یہ دو نام دیکھے تو باقی سب کو چلتا کیا اور ہمیں رکھ لیا۔"

اس کے بعد ہم دونوں دبک کر بیٹھ گئے اور پھر کبھی اس موضوع کو نہ چھیڑا آج پہلی مرتبہ آپ سے ذکر کر رہا ہوں۔ جی ایچ کیو کے نہاں خانے میں بیٹھے ہوئے۔ کسی دانائے راز نے ہم سے پوچھے بغیر کیپٹن دانش کو بلوچ رجمنٹ سے اور مجھے فرنٹیئر فورس رجمنٹ سے دائمی طور پر منسلک کر دیا اور ہم حسب الحکم اپنے اپنے رجمنٹل سنٹر میں فوجی تربیت کے لیے چلے گئے۔

فرنٹیئر فورس رجمنٹل سنٹر ایبٹ آباد میں واقع ہے' شام کو وہاں پہنچا تو مجھے سنٹر کے آفیسرز میس میں ٹھہرایا گیا جسے پفرز میس کہتے ہیں۔ یہ کسی آفیسرز میس میں ٹھہرنے کا میرا پہلا موقع تھا' میس بڑا پر شکوہ تھا' اس کا ڈرائنگ روم جسے وہ اینٹی روم (Ante Room) کہتے تھے۔ میرے ذاتی مکان کے کل رقبے کے برابر تھا' اس میں چمڑے کے بڑے بڑے دبیز صوفے اور ان سے بھی دبیز اور وسیع قالین بچھے تھے۔ دیواروں پر شکار کئے جانوروں کی کھالیں اور ان کے کٹے ہوئے سر ٹنگے ہوئے تھے' جن سے خاصا

خوف آتا تھا' دیواروں پر فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے اعلیٰ افسروں اور شہیدوں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ افسروں کی تصویریں دیکھ کر رشک آتا تھا اور شہدا کی تصویریں دیکھ کر دوسروں کے لئے اس مقام تک پہنچنے کے لئے دعائیں نکلتی تھیں۔ ساتھ کھانے والے کمرے میں جھانکا تو ایک وسیع ہال نظر آیا جو ہمارے کالج ہوسٹل کے ڈائننگ ہال سے ملتا جلتا تھا لیکن اس سے کہیں اعلیٰ نسل کا تھا۔ اس کا نہ صرف فرش اور فرنیچر کہیں بڑھیا تھا بلکہ ان کرسیوں پر بیٹھ کر بڑے بڑے انگریز افسر چھری کانٹا چلا چکے تھے میز پر جگہ جگہ ٹرافیوں' گھوڑوں اور نیزہ بازوں کے مجسموں کی شکل سے کوئی ڈیڑھ دو من چاندی بھی رکھی تھی' میں نے قریب جا کر ان چیزوں کا تنقیدی جائزہ لیا' تو یہ اصلی تھے نیزہ باز اور گھوڑے نہیں' چاندی کے تحائف' ان پر یہ تحائف پیش کرنے والے افسروں کے نام بھی کندہ تھے تاکہ سند رہے۔

اینٹی روم اور ڈائننگ روم کے علاوہ میس میں لیڈیز روم' بلیئرڈ روم' کارڈز روم' باتھ روم' کچن' پینٹری اور دوسرے سارے لوازمات تھے۔ یہ پفرز (Piffers) یعنی فرنٹیئر فورس سے تعلق رکھنے والے تمام افسروں اور جوانوں کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس گھر کے ایک کونے میں ایک رہائشی کمرہ اور ایک بیٹ مین دیا گیا جسے عرف عام میں اردلی کہتے ہیں۔ اردلی درحقیقت ایک پکا سپاہی ہوتا ہے جو اپنے افسر کی خدمت کرنا اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا ہے اور آفیسر اس سے خدمت لینا اپنا حق!

میں نے اس اردلی یعنی سپاہی گل بادشاہ کی رہنمائی میں افسری کے ابتدائی آداب سیکھے' اس نے سب سے پہلے میرا جراثیم خوردہ شیو کا مگ اٹھا کر باہر پھینکا اور اس کی جگہ کنٹین سے نیا پلاسٹک کا مگ لے آیا' اسے میرا برش بھی پسند نہ آیا۔ کہنے لگا۔ یہ آفیسر سٹینڈرڈ کا نہیں' لیکن اسے فوراً باہر نہ پھینکا' کہنے لگا کل آپ اپنی مرضی سے خرید لائیں تو بہتر ہو گا' اسے میرے جوتے بھی پسند نہ آئے' کیونکہ ان کی ایڑی ذرا گھس چکی تھی لیکن اس نے اس کا منہ اتنا چمکایا کہ ایڑھی کی طرف کسی کی نظر نہیں جا سکتی تھی۔ پھر اس نے میرا سوٹ کیس کھولا وردی استری کرا کر الماری میں لٹکائی اور پوچھا۔ ''کتنے جوڑے وردی کے لائے ہیں'' جواب دیا ''تین'' کہنے لگا کم ہیں۔ اچھے افسر کم از کم پانچ جوڑے رکھتے ہیں' سنٹر کا درزی ادھار بھی سی دیتا ہے'' پھر اسی تالیق نما خادم نے رات کو میرا بستر کھولا' سخت سرہانے پر ناپسندیدگی کا تھپڑ رسید کیا' لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ اس نے بستر لگایا' صبح اٹھانے کا وقت پوچھا اور چلا گیا۔

اگلے روز اس نے مقررہ وقت پر بیڈٹی اور اخبارات کے ساتھ مجھے جگایا' شیو کا سامان لگایا' مگ میں گرم پانی سجایا' ساتھ بلیڈ اور برش رکھا' اگر اس کا بس چلتا' تو شاید خود ہی شیو بھی بنا ڈالتا' لیکن فوج میں افسر کو بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے خود شیو بنایا' پہلے عموماً دو دفعہ چہرے پر بلیڈ پھیرتا تھا۔ آج تین مرتبہ پھیرا کہ کہیں افسری میں کسر نہ رہ جائے' خوب مل مل کر غسل کیا۔ نئی وردی اور

چمکتے ہوئے بوٹ پہنے، شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو پہچانی نہ گئی، کہاں ڈھیلا ڈھالا پروفیسر جو اکثر بش شرٹ اور کبھی کبھی سوٹ پہنتا تھا اور کہاں ایک کسا کسایا کپتان جو عمر میں اب کم از کم دس سال چھوٹا لگتا تھا۔ وردی کو کلف لگی تھی = کندھوں پر کپتانی سجی تھی۔ اس فضا میں ایبٹ آباد کے سبزہ زار، بلند و بالا پہاڑ اور سجیلے یوکلپٹس بہت بھلے لگے۔

فرز میس سے ایف ایف سنٹر بمشکل دو سو گز کے فاصلے پر تھا، چنانچہ میں نے وہاں تک پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ کپتانی کے نشے میں پہلے ہی میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے، دو سو گز کے راستے میں کوئی تین سو سلیوٹ ملے کیوں کہ ادھر سے بلوچ رجمنٹ، ایف ایف رجمنٹ، میڈیکل کور سنٹر اور آرمی میوزک سکول کے سپاہی اور رنگروٹ گزرتے تھے اور وہ اپنی سکھلائی کے مطابق دھڑا دھڑا سلیوٹ مارتے جاتے تھے، انہیں علم نہ تھا کہ سلیوٹ لینے والا یہ نقلی کپتان ہے جس نے آج ہی وردی پہنی ہے، میں نے بھی بھرم رکھنے کی پوری کوشش کی اور کبھی ہاتھ ہلا کر اور کبھی صرف زبانی ''وعلیکم السلام'' کہہ کر ان کے سلیوٹ کا جواب دیا۔

سینٹر میں پہنچ کر حسب ہدایت ایڈ جوٹنیٹ (ٹریننگ) کے پاس حاضری دی۔ اپنا مختصر سا تعارف کرایا اور بتایا کہ مجھے چار ہفتوں کی ملٹری ٹریننگ کے لئے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے۔ اس نے کہا۔

''ہم تو یہاں صرف رنگروٹوں کو ٹریننگ دیتے ہیں۔''

''مجھے بھی رنگروٹ ہی سمجھئے۔''

''لیکن آپ رنگروٹ تو نہیں لگتے۔''

''کیوں''

''ایک تو آپ کی عمر اچھی خاصی ہے، پھر آپ کے کاغذات میں تعلیم بھی ایم۔ اے سے اوپر لکھی ہوئی ہے۔ کندھوں پر کپتانی لگی ہے۔ رنگروٹ اس طرح کے تو نہیں ہوتے۔''

''تو پھر جی ایچ کیو سے پوچھئے کہ انہوں نے مجھے یہاں کیوں بھیجا۔''

ایڈ جوٹنٹ (ٹریننگ) جو خود کپتان تھا جی ایچ کیو کا نام سن کر کانپ گیا۔ پہلے سے زیادہ ملائمت سے بولا۔

''جی ایچ کیو کو کیا تکلیف دینا ہے، آپ ہی بتا دیجئے کہ اپنے کام کی نوعیت کے مطابق آپ کیا سیکھنا چاہیں گے ہم اس کے مطابق آپ کا ٹریننگ پروگرام بنا دیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''میرے خیال میں ایک جونیئر کیپٹن کے طور پر میرا زیادہ وقت سیلوٹ کرنے میں گزرے گا۔اس لئے اگر آپ مجھے سیلوٹ کرنا سکھادیں تو اس سے بہت سے سنیئر افسروں کا بھلا ہوگا۔''

''کچھ اور؟''

''بس ان چار ہفتوں کے لئے یہی کافی ہوگا' آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرے خیال میں ہر فوجی افسر کو حالت جنگ میں اپنی حفاظت کے لیے ریوالور اور سٹین گن کا استعمال آنا چاہیے۔''

''لیکن میرا تو جنگ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''ممکن ہے کسی اور کا ہو۔اس لئے آپ فائرنگ سیکھ لیں تو اچھا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے اگر وقت بچا تو یہ بھی کرلوں گا۔''

''اس کے علاوہ صبح کی پی۔ٹی صحت کے لئے بڑی ضروری ہے کیونکہ جب تک انسان علی الصبح اٹھ کر طلوع آفتاب سے پہلے نیکر پہن کر ایک گھنٹہ پی۔ٹی نہ کرلے دن بھر کی محنت کے لئے تیار نہیں ہو پاتا۔''

''آپ کا مطلب ہے ایک گھنٹے کی پی۔ٹی کے بعد مزید محنت؟''

''یہ پی ٹی تو Appetizer ہے۔''

''لیکن میری طرح شعروادب پر زندہ رہنے والا اس Appertizer کو مکمل غذا سمجھ لے تو.......''

''تو وہ شاعر اور ادیب تو ہوسکتا ہے فوجی نہیں ہوسکتا۔''

''پی ٹی سے تو مجھے کوئی نظریاتی اختلاف نہیں البتہ پی ٹی کا وقت ذرا محل نظر ہے۔''

''What Do You Mean?''(کیا مطلب آپ کا؟)''

''میرا مطلب ہے اگر میں یہ پی ٹی قسم کی چیز دن چڑھے دھوپ میں کرلیا کروں تو کیا حرج ہے؟''

''بہت حرج ہے۔فوج میں پی ٹی سب سے پہلے۔پھر ڈرل۔پھر کلاس روم کی پڑھائی پھر دیگر مصروفیات اور شام کو لازمی کھیلیں۔''

''تو گویا شام کو کھیلنا بھی لازمی ہے' ہمارے معمولات کے مطابق تو شام کا بہترین استعمال کافی ہاؤس میں بیٹھ کر انٹیلکچوئیل گپ شپ کرنا ہے۔''

''ایبٹ آباد میں ایسی مصروفیات کے لئے آپ کو کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

اگر آپ کھیل کود کا شوق نہیں رکھتے تو میس یا سنٹر کی لائبریری سے فوج نوعیت کی کتابیں لے کر پڑھیے مثلاً فرنٹیئر فورس رجمنٹ کی ہسٹری Cstoms of Service پہلی جنگ عظیم' دوسری جنگ عظیم' جنگ کوریا' عرب اسرائیل جنگ وغیرہ''

''اگر کوئی ہدایت یا مشورہ۔''

''ہاں ایک بات اور وہ یہ کہ اپنا ظاہری ڈیل ڈول اور وضع قطع بھی فوجی بنائیے' ہیر' شوز' اٹھنے بیٹھنے کا انداز' الفاظ کا چناؤ' افسروں اور غیر افسروں سے گفتگو کے آداب' میس لائف کے شعار وغیرہ....... خیر آپ پڑھے لکھے ہیں۔ رفتہ رفتہ سیکھ جائیں گے بشرطیکہ آپ اس طرف توجہ دیں۔''

''جی توجہ تو ضرور دوں گا۔''

''اچھا تو پھر کل سے آپ کا ٹریننگ پروگرام شروع' ابتدا سیلوٹ سے ہوگی' آپ کے انسٹرکٹر کا نام ہے حوالدار رفیق' مقام ٹریننگ گراؤنڈ' لباس وردی' وقت۔ صبح سات بجے' ٹریننگ پیریڈ۔ سات سے نو بجے' او۔کے' گڈ لک۔''

میں اگلے روز بہ اہتمام بہت سویرے جاگا۔ ریڈیو سیلون سے گانے اور بی بی سی سے خبریں سننے کا ناغہ کیا۔ اردلی کی مدد سے جلدی جلدی وردی زیب تن کی' شیشے میں ایک نظر اپنی کپتانی پر ڈالی اور خراماں خراماں پریڈ گراؤنڈ پہنچا۔

حوالدار رفیق اپنی پوری سپاہیانہ آب وتاب کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے دور سے آتے دیکھ کر اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی' میں قریب پہنچا تو اس نے مجھے سیلوٹ کیا۔ بے تکلفی نہ ہونے کی وجہ سے میں نے معانقے سے گریز کیا البتہ اس سے مصافحہ کیا۔ اس کا اور اس کے بال بچوں کا حال پوچھا۔ تھوڑا سا اپنا تعارف کرایا اور اسے یہ نوید سنائی کہ مجھے اس سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

میری اس گفتگو سے وہ بالکل مرعوب نہیں ہوا بلکہ کسی حد تک اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھر آئے۔ شاید میں نے فوجی آداب (Customs of Service) کے مطابق اس سے گفتگو نہیں کی تھی۔ اس نے کہا۔

''ایڈجوٹنٹ صاحب نے ہم کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ ہم نے آپ کو سیلوٹ کرنا سکھانا ہے لیکن صاحب سکھلائی سے پہلے تین بات سمجھ لو!

نمبر ون۔ فوج میں سات بجے کا مطلب سات بجکر پانچ منٹ نہیں ہوتا بلکہ چھ بجکر ۵۵ منٹ ہوتا ہے۔

نمبر ٹو۔آپ پریڈ گراؤنڈ میں میرا اور میرے بال بچے کا حال احوال نہیں پوچھے گا۔اور میرا بال بچہ ہے بھی نہیں۔

نمبر تھری۔آپ نے فوجی وردی پہن لی ہے لیکن آپ کا ٹرن آوٹ ٹھیک نہیں ہے۔آپ کا ہیر کٹ فوجی نہیں ہے۔بوٹ فوجی ڈیزائن کے مطابق نہیں' بیلٹ ڈھیلا ہے اور آپ کا شیو بھی ٹھیک نہیں ہے۔خود کیا ہے یا نائی سے بنوایا ہے۔ویسے سنٹر میں نائی بہت اچھا ہے آپ کا رائٹ مونچھ بھی لیفٹ والے مونچھ سے بڑا ہے یہ سب کل صبح ٹھیک ہونا چاہیے' صرف وردی پہننے سے فوجی افسر نہیں بنتا...... کوئی شک؟''

''ایک سوال ہے؟''

''سوال کا موقع بعد میں ملے گا' پہلے آج کے سبق کے بارے میں کوئی شک ہے تو بولو۔''

''کوئی شک نہیں۔''

اتنے میں ایبٹ آباد کا موسم اپنا رنگ دکھانے لگا۔ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی' فضا میں مزید خنکی آ گئی' ارد گرد سرسبز شاداب درخت اور سبز ہو گئے۔پہاڑوں کا جوبن اور نکھر آیا اور مجھے انگریزی ادب کا رومانی شاعر ورڈز ورتھ (Words Worth) یاد آنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو صاحب' اگلے کاشن کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''تیار ہوں۔''

''اٹینشن (Attention)''

میں اپنی بساط کے مطابق اٹینشن ہو گیا' جس کی تربیت میں نے کالج کے زمانے میں U.O.T.C کے ذریعے حاصل کی تھی۔

''دیکھو صاحب' سلیوٹ تین قسم کا ہوتا ہے ایک کھڑے کھڑے سلیوٹ' دوسرا چلتے چلتے سلیوٹ اور تیسرا چلتے چلتے اچانک رک کر سلیوٹ۔کوئی شک؟''

''آپ نے یہ تو بتایا نہیں کہ سلیوٹ دائیں ہاتھ سے کیا جاتا ہے یا بوقت ضرورت بائیں ہاتھ سے بھی جائز ہے؟''

''یہ بعد میں بتائے گا پہلے سلیوٹ کا طریقہ سیکھو۔''

پھر اس نے سلیوت کا طریقہ بتایا خود تینوں طرح کا سلیوٹ کر کے دکھایا اور پیشہ ورانہ روانی کے ساتھ بتایا کہ بازو کی حرکات و سکنات میں کتنے سکینڈ کا وقفہ ہونا چاہیے اور ہر وقفے کے ماپنے کے لئے دل میں کتنی بار ون' ٹو' تھری کہنا چاہیے۔

حوالدار کی روانی گفتار کے ساتھ بارش بھی رواں ہوگئی، میں سمجھا چلو چھٹی ہوئی لیکن رفیق کے عزائم مختلف تھے وہ مجھے کوئک مارچ کراتا ہوا قریبی شیڈ (Shed) میں لے گیا جس کی چھت ٹین کی بنی ہوئی تھی اور دیواروں کی جگہ وقفے وقفے پر ستون یا کھمبے بنے تھے چار ایک طرف چار دوسری طرف۔

جب میں شیڈ کے نیچے کھڑا ہوا تو اس پر برسنے والی برکھا سے جلترنگ جاگ اٹھا میں سوچنے لگا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا موسیقار ہے، کیا منجھے ہوئے آرٹسٹ کی طرح ساز و آواز آہنگ بیدار کر رہا ہے۔ اس میوزک کے ساتھ آس پاس کا منظر بھی اپنے رومانی پیرہن سمیت بھیگ گیا۔

''اٹین....... شن (Atten-Tion)''

انسٹرکٹر کی گرجدار آواز نے مجھے لرزا دیا۔

''دیکھو سر جب آپ مارچ کر کے شیڈ کے اندر آیا تو اٹینشن کی پوزیشن میں تھا جب تک دوسرا کاشن نہیں ملتا آپ نے اٹینشن کی پوزیشن میں رہنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

اس کے بعد وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا، لمحے بھر کے توقف کے بعد بولا۔

''سر ایک مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔''

''کیا۔''

''یہ کہ آپ کپتان ہیں، میں این سی او ہوں، میں آپ سے سیلوٹ نہیں لے سکتا۔ ہم ابھی ایڈ جوٹنٹ صاحب کے پاس جاتا ہے پوچھنے کے لئے، آپ اتنے میں سامنے والے کھمبے کو اپنا سنیئر سمجھ کر سکھلائے ہوئے طریقے کے مطابق سیلوٹ کی پریکٹس کریں۔''

یہ کہہ کر اس نے نہایت سمارٹ سیلوٹ کیا اور مارچ کرتا ہوا ایڈ جوٹنٹ صاحب کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں اگلے کاشن کے انتظار میں گزشتہ پچیس برس سے سنیئر کھمبوں کو سیلوٹ کر رہا ہوں۔

یہ جسمانی ٹریننگ باقاعدگی سے جاری تھی۔ میں علی الصبح حوالدار رفیق کی خدمت میں پیش ہو جاتا اور وہ مجھے سیلوٹ، مارچنگ اور ڈرل وغیرہ سکھاتا رہتا۔

ایک دن اس نے کہا کہ مجھے جو کام سونپا گیا تھا وہ پورا ہوگیا ہے۔ اگر آپ نے کچھ سیکھنا ہو تو بتا دیجئے۔ میں نے کہا پستول کیسے

چلاتے ہیں اس نے خالص پیشہ ورانہ جواب دیا۔ یہ ویپن ٹریننگ (Weapon Training) میں آتا ہے ہم ایڈ جوئنٹ صاحب کو بولے گا۔ اگر انہوں نے منظور فرمایا تو دوسرا انسٹرکٹر Detail ہو جائے گا۔ چنانچہ اگلے دن دوسرا انسٹرکٹر آیا غالباً اس کا نام حوالدار نذیر تھا۔ اس نے ریوالور کے متعلق ابتدائی باتیں بتائیں۔ اسے کھولنا اور جوڑنا سکھایا پھر لوڈ اور ان لوڈ کرنے کی Demonstration دی۔ میں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ کئی مرتبہ لبلبی پہلے دبا دی اور لوڈ بعد میں کیا' لیکن ہم صرف خالی ریوالور سے کھیل رہے تھے کوئی دو ہفتے کی تھیوری کے بعد مجھے پہلی مرتبہ پریکٹس راؤنڈ دیئے گئے' جنہیں میں نے بڑی مہارت سے فائرنگ رینج پر چلایا۔ ایک ہفتے کی پریکٹس کے بعد امتحان کا وقت آیا' جس کے لئے سات گولیاں دی گئیں' میں نے سکھلائے ہوئے طریقے کے مطابق زمین پر لیٹ اور سانس روک کر کے بعد دیگرے سات گولیاں چلا دیں' کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ان میں سے پانچ ٹارگٹ پر جا لگیں' باقی دو کا سراغ نہ ملا' یوں ریوالور سکھلائی کا مرحلہ طے ہو گیا تو سٹین گن کی باری آئی۔ یہ کوئی ایسی ویسی گن نہ تھی جس کا ترجمہ ہم توپ پڑھتے آئے تھے۔ یہ ریوالور سے ذرا بڑا ہتھیار تھا' گولیاں ذرا زیادہ تیز اور دور تک مارتا تھا۔ یہ ہتھیار مجھے خاصا پسند آیا۔ چند روز میں میں اس سے کھیلنا سیکھ گیا۔ امتحان والے دن سات کی سات گولیاں ٹارگٹ پر دے ماریں۔ یوں میں ہر آفیسر کے ان دونوں Personal Weapons کی سکھلائی میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ جنگ کے دوران ہر آفیسر کو ان میں سے (کم از کم) ایک ہتھیار ذاتی حفاظت کے لئے پاس رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے دل میں کہا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میری ٹریننگ ہنوز جاری تھی کہ مجھے گھر سے تار آیا کہ میری اکلوتی بیوی سخت بیمار ہے' فوراً چھٹی لی' گاؤں پہنچا۔ بیوی کو گاڑی میں لاد کر قریبی ہسپتال' سی ایم ایچ کھاریاں کی طرف روانہ ہوا اور راستے میں سوچتا رہا کہ داخلے کے مراحل کیسے طے ہوں گے۔ جنرل وارڈ بیڈ مل بھی گیا تو الگ کمرہ کیسے نصیب ہوگا۔ پھر ڈاکٹر کو کہاں سے بلواؤں گا۔ اگر انہوں نے آپریشن کا مشورہ دیا تو خون کی بوتلیں کہاں سے مہیا کروں گا۔ میں انہیں خدشات میں گھرا ہسپتال کے ایم آئی روم میں پہنچا۔ وہاں اپنا نمبر' نام اور رجمنٹ بتانے کی دیر تھی کہ ہسپتال کا عملہ فوراً حرکت میں آ گیا۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا معائنہ کیا۔ اسے سٹریچر پر ڈلوایا۔ کمرے میں پہنچایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ماہرین آ گئے۔ خود ہسپتال کے کمانڈنٹ تشریف لے آئے' پھر خود ہی انہوں نے خون کا بندوبست کیا۔ آپریشن کیا۔ تیمارداری کے لئے خود ہی نرسنگ سٹاف متعین کیا اور ایک ماہ بعد مجھے ڈھائی روپے یومیہ کے حساب سے خوراک بل بھیج دیا اور بس! میں بڑا متاثر ہوا' میں نے سوچا اگر ایک نامکمل سے کپتان کی بیوی کے لئے اتنا کچھ کیا جا سکتا ہے تو خود کپتان کے لئے کس چیز کی کمی ہوگی۔ میرا خود بیمار

پڑنے کو جی چاہا لیکن میں نے یہ کام ذرا موخر کر دیا البتہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پروفیسر حمید احمد خاں کے جزیرے کی عدم موجودگی میں بہترین جزیرہ یہی ہے۔

میں واپس ایف ایف سنٹر آیا' تو تمام افسروں نے افرادِ خانہ کی طرح میری دلجوئی کی' بیوی کا حال پوچھا اور اس کی صحت یابی کے لئے دعا کی۔

ابھی میری ٹریننگ جاری تھی۔ میری جسمانی تربیت کے علاوہ میری ذہنی تربیت پر بھی خاصی توجہ دی جا رہی تھی۔ عسکری نوعیت کی کتابیں پڑھوانے کے علاوہ مجھے فوج کی روایات سے بھی آگاہ کیا جا رہا تھا' جس طرح گاؤں میں بڑی بوڑھیاں چھوٹے بچوں کو کہانیاں سنا سنا کر ان کی کردار سازی کرتی ہیں اس طرح مجھے بھی سینئر آفیسر فوج کے کئی قصے سناتے رہتے تھے' جن میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر کروں گا۔ پہلا واقعہ پابندی وقت کے متعلق ہے' دوسرا ڈسپلن کے بارے میں اور تیسرا تعمیل حکم کی بابت'' ''ایک کمانڈنگ آفیسر نے پلٹن کی پریڈ کا معائنہ کرنے کے لئے صبح سات بجے کا وقت دیا' پریڈ پندرہ منٹ پہلے فال ان (fall in) ہو گئی' سات بجنے سے پہلے ایڈ جوٹنٹ نے جے سی او سے پریڈ کی کمان سنبھالی۔ پریڈ کو اٹینشن کیا اور کمانڈنگ آفیسر کا انتظار کرنے لگا۔ سات بج گئے مگر کمانڈنگ آفیسر نہ پہنچ پائے۔ پریڈ نے پانچ منٹ مزید انتظار کیا۔ سی۔ او پھر بھی نہ پہنچے۔ ایڈ جوٹنٹ نے پریڈ برخاست کر دی۔ جوان مارچ کرتے ہوئے اپنی بیرکوں میں چلے گئے۔ ایڈ جوٹنٹ اپنے کمرے میں آ گئے۔ بعد میں کمانڈنگ آفیسر آئے اور انہوں نے بلا اجازت پریڈ برخاست کرنے پر اظہار ناراضگی کرنے کی بجائے اظہار شرمندگی کیا اور خاموش ہو گئے۔

ڈسپلن کے بارے میں یہ واقعہ سنایا گیا۔

انگلستان میں ایک لفٹین صاحب جو نئے نئے اپنی پلٹن میں آئے تھے' اپنی پلاٹون کو سمندر سے ملحقہ پریڈ گراؤنڈ میں ڈرل کرا رہے تھے۔ ڈرل کرانے والے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ پریڈ کو روکنے کے لئے ہالٹ (Halt) کا کاشن دو قدم پہلے دیا جائے اور وہ بھی دائیں قدم پر' پلاٹون مارچ کرتی ہوئی سمندر کی طرف جا رہی تھی اور لفٹین صاحب یہ طے نہ کر پا رہے تھے کہ کس وقت ہالٹ بولوں۔ چنانچہ اسی تذبذب (Indecision) میں پوری کی پوری پلاٹون مارچ کرتی ہوئی سمندر میں گر گئی۔

تعمیل ارشاد کا واقعہ یہ تھا کہ ایک جے سی او نے چند فوجی جوانوں کو ایک صف میں کھڑا کیا اور انہیں حکم دیا کہ بھاگ کر جاؤ اور سامنے والا درخت اکھاڑ کر لے آؤ۔ پانچ جوانوں میں سے ایک سوچتا رہ گیا کہ بھلا درخت کیسے اکھاڑ جا سکتا ہے لیکن باقی چاروں حکم

پاتے ہی درخت کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ چاروں پاس اور سوچنے والا فیل قرار دیا گیا۔

فوجی ٹریننگ کا ایک خاصا یہ ہوتا ہے کہ انسان باقاعدہ سکھلائی کے علاوہ بھی روزمرہ زندگی میں بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ مثلاً میں جب ۱۹۶۴ء کے آخر میں ایبٹ آباد میں زیر تربیت تھا تو ان دنوں اہم سیاسی موضوع جنوری ۱۹۶۵ء میں ہونے والے صدارتی انتخاب تھے' مقابلہ فیلڈ مارشل ایوب خاں اور محترمہ فاطمہ جناح کے درمیان تھا۔ ٹی بریک کے دوران کوئی نہ کوئی افسر میری سیاسی بصیرت کو اینٹھ کر مجھے چھیڑ دیتا کہ میرے خیال میں انتخابی مہم کیسی چل رہی ہے اور فاطمہ جناح کے جیتنے کے کیا امکانات ہیں۔ میں تازہ تازہ سویلین زندگی سے آیا تھا فوجی آداب سے واقف نہ ہونے کی بنا پر موضوع پر کھل کر اظہار خیال کرنے لگتا۔ پچھلے چھ برسوں میں فیلڈ مارشل کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر سیر حاصل تبصرہ کرتا۔ محترمہ فاطمہ جناح اور بانی پاکستان سے ان کے قریبی رشتے پر روشنی ڈالتا اور مستقبل کے بارے میں خاصے وثوق سے پیشن گوئی کرتا کہ اگر محترمہ فاطمہ جناح جیت نہ بھی سکیں تو بھی فیلڈ مارشل کو ناکوں چنے چبوائیں گی۔

دراصل یہ میرا دلپسند موضوع تھا جس طرح خالص فوجی شمالی افریقہ میں فیلڈ مارشل کی لومڑانہ جستوں پر روانی سے بولتے تھے۔ اسی طرح میں جمہوریت اور مارشل لاء کے محاسن و نقائص پر رواں تبصرہ کرتا تھا۔ لیکن ایک دن چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل الطاف نے ٹی بریک کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور سمجھایا کہ فوج میں بات کرنا شجر ممنوع سمجھا جاتا ہے اور اپنے سینئر خاص صدر مملکت جو فیلڈ مارشل بھی ہیں کے متعلق اظہار رائے کرنا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ لہٰذا اگر تمہیں اپنی کپتانی عزیز ہے تو آئندہ اپنا منہ بند رکھنا۔''
۔۔ میں ''یس سر'' کہہ کر واپس آ گیا اور کبھی ان کے سامنے سیاسی موضوع پر اظہار خیال نہ کیا۔

ان دنوں مہینے میں ایک مرتبہ ڈنر نائٹ ہوتی تھی جس میں سب آفیسر میس کٹ پہن کر آتے تھے اور خالص فوجی آداب کے مطابق چھری کانٹے سے کھانا کھاتے تھے۔ ڈنر سے پہلے ڈرنکس اور ڈنر کے بعد ڈانس کا رواج تھا۔ مجھے ڈرنک' ڈنر اور ڈانس کے آداب کا سرے سے کوئی علم نہ تھا۔ ڈرنکس کے دوران کوکا کولا پی کر شرابیوں کا ساتھ دیا۔ ڈنر میں دوسروں کی نقل کرتے ہوئے چھری کانٹے کے جوہر دکھائے لیکن ڈانس کے وقت ذرا مشکل پیش آئی۔

دراصل ڈانس کے متعلق روایت یہ تھی کہ تمام سیر شکم افسر ایک دائرہ بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے' پس منظر میں بینڈ دھنیں بجاتا تھا۔ اور نوجوان افسروں کی ایک ٹولی میدان میں کود پڑتی تھی اور خوب داد رقص دیتی تھی پھر دوسرے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے جو ذرا ہچکچاتے تھے انہیں کھینچ کھینچ کر میدان میں لایا جاتا تھا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے میں ایک نیم تاریک گوشے میں چھپ

کر بیٹھ گیا۔ادھر ذرا گھما گھمی کم ہوئی تو ایک صاحب میرے پاس سے گزرتے ہوئے اچانک رک گئے۔نیم تاریک گوشے میں مجھے پہچان نہ سکے۔کہنے لگے۔

''میجر تاج؟''

عرض کیا''نہیں' کیپٹن سالک''

''اوہ' اچھا جو حال ہی میں آئے ہیں اور کچھ ایم اے' ویم اے کر رکھا ہے...

دیکھو! اگر فوج میں نوکری کرنی ہے تو کچھ کچھ سوشل ہو جاؤ اور اپنے حجاب توڑ ڈالو۔''

میں نے یہ بات پلے باندھ لی اور آج تک اسے نہیں کھولا۔رسم زمانہ کے باوجود شراب پی سکا نہ ڈانس کر سکا۔میرے صبر کا اللہ تعالٰی نے یہ پھل دیا کہ کچھ عرصے کے بعد فوج میں شراب حکماً بند ہو گئی اور ڈانس نظام اسلام کی ہماہمی میں معیوب سمجھا جانے لگا۔

جہاں تک حجابات کا تعلق ہے مجھے افسوس ہے کہ فوجی تربیت اور طویل فوجی ملازمت کے باوجود میرے تعصبات کی طرح میرے حجابات بھی میرے ساتھ رہے' روایتی چیتے کی طرح جو دھاریاں اپنے جسم و جان پر لے کر فوج میں شامل ہوا تھا' وہی دھاریاں آج بھی مجھ پر موجود ہیں۔

''فوجی افسروں کی اصل تربیت گاہ تو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول جہاں دو سالہ تربیت کے دوران کی دھاریاں ہی نہیں ان کی کھال بھی بدل دی جاتی ہے' جس کے لیے وہ ایسا خام مال منتخب کرتے ہیں جو اس بھٹی میں با آسانی گل کر نئی ساخت میں ڈھل جاتا ہے۔میرے سلسلے میں شاید میرے کوزہ گروں کو احساس تھا کہ اس کی مٹی اتنی پک چکی ہے کہ اگر اسے توڑا گیا تو شاید دوبارہ جڑ نہ سکے۔چنانچہ تھوڑی سی ملمع کاری سے مجھے چکا کر فوج کے لیے قابل قبول بنا دیا گیا۔''

''میرے قیام ایبٹ آباد کے آخری ایام تھے کہ ایک بہت ہی سنیئر میجر جہانگیر تشریف لے آئے۔بنگلہ ملنے کے انتظار میں فرز میس میں رہنے لگے' ان سے اکثر کسی نہ کسی کھانے پر ملاقات ہو جاتی تھی۔ایک صبح ناشتے کی میز پر میں نے ایک ٹوسٹ چھری کانٹے کی مدد سے کھانے کے بعد اپنے ہتھیار ایک طرف رکھے اور دوسرے ٹوسٹ کو مکھن اور جام لگا کر ہاتھ سے (بلکہ منہ سے) کھاتے لگا' میجر جہانگیر میری یہ حرکت دیکھ کر کہنے لگا''

''کیپٹن سالک' تم بڑے خوش قسمت ہو کہ فوج میں ایسے وقت آئے' جب تم ہاتھ اور منہ سے ٹوسٹ کھا سکتے ہو۔ہم اس وقت فوج میں آئے تھے' جب انگریزوں کے چلے جانے کے باوجود انگریزوں کا Way of Life اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ قائم

تھا۔ ہر میس میں ملکہ برطانیہ یا اس کے پیش رو کی تصویر ٹنگی تھی۔ انگریزی کے علاوہ کسی اور زبان میں اظہار خیال کرنا کلمہ کفر سمجھا جاتا تھا۔ صرف ویٹر' کک یا بیٹ مین سے اردو میں بات کی جا سکتی تھی اور وہ بھی انگریزی لہجے میں' تا کہ انگریزی نہیں تو کم از کم اس کا لہجہ Nanive تک پہنچ سکے' دن بھر بالعموم اور غروب آفتاب کے بعد بالخصوص ٹائی کے بغیر آفیسر میس میں داخلہ ناممکن سمجھا جاتا تھا ناشتے اور کھانے میں چھری کانٹے کا استعمال لازمی تھا' عورت اور سیاست پر بات کرنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اردو گانے یا مشرقی میوزک سننا افسری شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔''

''آپ اس وقت کیا تھے؟''

''میں اس وقت او۔ ٹی۔ ایس سے کمشن پا کر نیا نیا سیکنڈ لفٹین بنا تھا''

''اس وقت کا کوئی دلچسپ واقع؟''

''بہت ہیں' آج تو اس دور کا ہر واقع ایک لطیفہ لگتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یونٹ میں ایک سی' او ہوتے تھے' لیفٹیننٹ کرنل یعقوب۔ بڑے خاندانی آدمی تھے' اپنی کار میں آتے تھے' ہم لفٹین عموماً میس سے یونٹ تک پیدل آتے تھے' ایک دن وہ ہمیں راستے میں مل گئے' گاڑی روک لی پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا Get In ہم تینوں جمپ لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ چلنے لگے۔ ہم نے زور سے دروازہ بند کیا' انہوں نے گاڑی روک لی اور کہا ''Get Out'' ہم جمپ لگا کر باہر آ گئے۔''

''شام کو کرنل یعقوب میس میں ملے تو انگریزی وضع کا خوبصورت سوٹ پہنے انگلش میوزک سن رہے ہیں' ہمیں دیکھ کر کہنے لگے''

'' Are you comfortable in the Mess!Hello, Young Men! Any Suggestions for its Improvement.''

ہم میں کیپٹن اصغر جو سرگودھا کا رہنے والا تھا' نسبتاً دلیر تھا' اس نے کہا۔

''Sir, Could We Have Lessi and Paratha at Breakfast.''

(کیا ہم ناشتے میں لسی اور پراٹھا لے سکتے ہیں)

کرنل صاحب نے خشمگین نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا گویا کچا چبا جائیں گے۔ صرف اتنا کہا ''Non-Sense'' (احمق) اور چھڑی گھماتے چلے گئے۔ چند روز بعد اس آفیسر کا کسی اور یونٹ میں تبادلہ کرا دیا گیا ''یعنی جھاڑ بھی انگریزی میں'' ''ہر شے انگریزی میں۔ انگلش گفتگو' انگلش میوزک' انگلش آداب....... عرض کیا ''میں تو سمجھتا ہوں اب بھی انگلش بہت ہے''

’’مثلاً‘‘

’’مثلاً میں ایم اے انگلش، یہ آلو کاٹلس انگلش، ریڈیو پر خبریں انگلش، لباس انگلش، کراکری اور کٹلری انگلش

انہوں نے فرمایا۔ ’’بس، بس‘‘

میں نے دبی زبان میں کہا۔

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ایف ایف سنٹر میں اپنی تربیت مکمل کر کے روالپنڈی کے لئے روانہ ہونے لگا تو سنٹر والوں نے اطلاع دی کہ ایک فوجی جیپ کسی اور کام سے جی ایچ کیو جا رہی ہے اگر تم چاہو تو اس پر جا سکتے ہو لیکن سرکاری قواعد کے مطابق تمہیں سفر باوردی کرنا ہوگا۔ مجھے ان دنوں ویسے بھی کلف لگی وردی پہننے کا بہت شوق تھا۔ میں نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ اپنا سامان اور اردلی جیپ میں ڈالے اور خود تن کر ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ جب ایبٹ آباد بازار سے گزرا تو ڈیوٹی پر کھڑے ٹریفک سارجنٹ نے سلیوٹ مارا، ذرا آگے بڑھا تو ایک پولیس کانسٹیبل جو ڈھیلا ڈھالا کھڑا تھا، فوراً تن گیا اور اس نے اپنی بساط کے مطابق ایک اچھا سلیوٹ میری نذر کیا۔

میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے سوچا تعجب ہے اس ملک کے دس کروڑ عوام پولیس سے ڈرتے ہیں اور پولیس فوج سے، حالانکہ اس وقت تک ملک میں صرف ایک مارشل لاء لگا تھا۔

◆◆◆

ہر چمکدار شے سونا نہیں ہوتی

ٹریننگ کے بعد میری باقاعدہ پوسٹنگ آئی ایس پی آر میں ہوئی جو انٹر سروسز پبلک ریلیشنز کا مخفف ہے' اس ادارے کا بنیادی کام افواج پاکستان اور عوام کے درمیان رابطہ قائم رکھنا ہے اور عوام کے دلوں میں افواج پاکستان کے لئے خیر سگالی کے ایسے جذبات پیدا کرنا ہے کہ وہ دفاع وطن کے بارے میں اپنی افواج کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد رکھیں اور آڑے وقت میں ان کی پشت پناہی کریں۔

یہ بڑا اعلیٰ وارفع مقصد تھا اور مجھے خاصا شوق تھا کہ اس محکمے میں رہ کر میں وہ تمام گر سیکھ لوں جو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں' چنانچہ میں بہت سی امیدوں' تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اس شعبے میں داخل ہوا۔

سب سے پہلے اس کی عمارت نے مجھے مایوس کیا' راولپنڈی کلب کے پیچھے ہلال روڈ پر راولپنڈی کلب کے خاکروبوں کے کوارٹروں کے عین سامنے' ایک خستہ حال عمارت تھی جسے عمارت کہنا مبالغہ ہوگا' دوسری جنگ عظیم کی گارے کی بنی ہوئی دو بیرکیں تھیں جن پر کمانی دار چھتیں پڑی ہوئی تھی' چھتوں کے نیچے'' False Ceiling '' کے طور پر کسی زمانے میں گتے کے تختے چپکائے گئے تھے' جو امتداد زمانہ کے ہاتھوں جگہ جگہ سے پچک گئے تھے' چند ایک لٹک بھی رہے تھے اور جو ابھی تک چھت کے ساتھ چسپاں تھے' ان پر بارش کے بڑے بڑے داغ نمایاں تھے۔ چھت اور گتے کے درمیان خلا میں چوہے اور بلیاں آنکھ مچولی کھیلا کرتی تھیں' کونوں میں کبوتروں اور چڑیوں کا بسیرا تھا' مجموعی طور پر کیفیت چچا غالب کے گھر سے ملتی جلتی تھی

میری وحشت مٹانے کے لئے ایک پرانے رفیق کار نے فرمایا۔ ''گھبراؤ نہیں یہ وہی تاریخی ادارہ ہے' جس میں ''مگرائے حسینہ نازنین۔ مجھے تجھ سے عشق نہیں'' کے مصنف کرنل مجید ملک' لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض' میجر چراغ حسن حسرت اور میجر سید ضمیر جعفری کام کرچکے ہیں اور یہ سرنگوں برآمدہ جس کے گرنے کے خوف سے تم پیلے پڑ رہے ہو' فیض صاحب کا پسندیدہ برآمدہ تھا کیونکہ جب دفتر کا چپڑاسی ان کی سائیکل ادھار مانگ کر لے جاتا تھا اور چھٹی تک واپس نہیں آتا تھا تو وہ اسی برآمدے میں کھڑے سگریٹ پی پی کر اس کا انتظار کیا کرتے تھے' اپنے نئے خاندان کی ان اعلیٰ روایات پر مجھے رشک آنے لگا۔

اس ادارے کو ذرا اندر سے ٹٹولا تو یہ بھی میری طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر یعنی آدھا سویلین اور آدھا فوجی نکلا۔ اس کے اوپر اوپر

پکے دودھ کی بالائی کی طرح فوجی افسروں کی ایک دبیر تہہ تھی اور نیچے کچی لسی کی طرح سویلین سٹاف تھا۔ مجھے پکے افسروں اور کچے عملے کے درمیان ایک ایسی پوسٹ پر لگایا گیا جس کے ذمے پیشہ ورانہ فرائض کے علاوہ ادارے کا ڈسپلن اور نظم و نسق بھی قائم رکھنا تھا۔

میں نے اپنی حالیہ فوجی سکھلائی کے مطابق سب سے پہلے پابندی وقت پر زور دیا' حوالدار رفیق نے مجھے بتایا تھا کہ فوج میں سات بجے کا مطلب سات بج کر پانچ منٹ نہیں بلکہ چھ بجکر پچپن منٹ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب میں ایک نوجوان کپتان کی اتھارٹی سے لیس ہو کر سٹاف آفیسر گریڈ تھری (S.O.3) کی کرسی پر بیٹھا تو میں نے متعلقہ عملے کو بلا کر ہدایت کی کہ دفتری اوقات ساڑھے سات بجے شروع ہوتے ہیں' جس کا مطلب سات بجکر ۲۵ منٹ ہے الہٰذا کل میں ۷ بجکر ۲۵ منٹ پر دفتر آؤں گا اور پابندی وقت کی خود انسپکشن کروں گا۔

اگلے روز میں دفتر پہنچا تو دفتر بند پڑا تھا' پتہ چلا کہ جس ڈیوٹی کلرک نے جی ایچ کیو ڈیوٹی روم سے چابیاں لے کر آنا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ طلوع ہوا اور کسی ندامت کے بغیر کہنے لگا۔ ''میری سائیکل پنکچر ہوگئی تھی۔''

میں نے عملے کو دوبارہ اکٹھا کیا' مزید ہدایات دیں اور سختی سے تاکید کی کہ کل صبح جب میں دفتر پہنچوں تو ہر دفتر نہ صرف کھلا ہونا چاہیے بلکہ چپڑاسی اپنا کام مکمل کر چکے ہوں' میز چمک رہے ہوں' قلم دوات تیار رکھے ہوں اور ہر شخص اپنی سیٹ پر موجود ہو۔ سب نے ''ٹھیک ہے' سر'' کہا اور میں مطمئن ہوگیا۔ اگلے روز دفتر آیا تو بیرونی گیٹ سے لے کر اندرونی کمرے تک ہر شے گرد و غبار میں اٹی پڑی تھی' مٹی کے بادل اڑ رہے تھے' میں سائیکل سے اتر کر گیٹ کے باہر ہی رک گیا' آواز دے کر ڈیوٹی کلرک کو بلوایا اور پوچھا کہ کیا ماجرا ہے۔ اس نے بتایا کہ میری کل کی جھاڑ کے بعد سپرنٹنڈنٹ صاحب نے جی ایچ کیو سے خاکروبوں کی ایک خاص جماعت منگوائی ہے جو سارے دفتر میں جھاڑو دے رہی ہے۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو بلوایا انہیں کھری کھری سنائیں۔ میرا یہ جہاد کئی ہفتے جاری رہا لیکن اصلاح احوال کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی البتہ اس کا ایک اثر ضرور ہوا کہ میری شکایات دھڑا دھڑ اوپر پہنچنے لگیں اور چند ماہ بعد جب ڈائریکٹر صاحب نے میری سالانہ رپورٹ میں میری کارکردگی کا جائزہ لیا تو درج فرمایا کہ

''کیپٹن سالک ایک پڑھا لکھا جوان ہے' جس میں ایک اچھا افسر بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں' لیکن Man Management اور Tact میں کورا ہے' جب سے یہاں آیا ہے اس نے ڈائریکٹریٹ کا برسوں پرانا سکون تباہ و برباد کر دیا ہے' سارا عملہ اس سے نالاں ہے اسے مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی یہ کمزوری جلد از جلد دور کر لے۔''

میں نے حالات کا بغور جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ اگرچہ دفتر ساڑھے سات بجے لگتا ہے لیکن کوئی شخص آٹھ بجے سے پہلے نہیں آتا بلکہ

جو افسر جتنا سینئر ہے' اتنا ہی لیٹ آتا ہے' اس لحاظ سے ڈائریکٹر صاحب کی باری نو بجے کے بعد آتی ہے اور وہ بھی یوں کہ وہ اپنی رہائش گاہ پر تیار ہو کر دفتر میں فون کر دیتے تھے' ''ہم تیار ہو گئے ہیں' میاں موٹر بھجوا دو۔'' موٹر پہنچنے کے کوئی دس منٹ بعد وہ بھی پہنچ جایا کرتے تھے۔

میں نے اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھالنا شروع کیا' پہلے تو وقت مقررہ سے پانچ منٹ پہلے آیا کرتا تھا' اب پندرہ منٹ بعد آنے لگا۔ جب دیکھا کہ میں ہنوز ان کے معیار پر پورا نہیں اترا تو گھنٹہ پون گھنٹہ دیر سے آنے لگا۔ میرے دیر سے آنے سے سبھی لوگ سکون میں آ گئے اور اگلے سال میرے ڈائریکٹر نے میری مدح میں لکھا۔

''ایک سال کے قلیل عرصے میں متعلق آفیسر نے بے مثال دانشمندی' فراست اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا ہے' اب اس نے اپنی کمزوریوں اور مشکلات پر قابو' پا لیا ہے' حالات کے ساتھ خوب Adjust ہو گیا ہے اور میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایک روشن مستقبل اس کا منتظر ہے۔''

اس کے بعد میں حوالدار رفیق کی سکھائی ہوئی دوسری باتوں پر عمل درآمد ترک کر دیا۔

میں جب اپنی مشکلات پر قابو پا چکا تو میں نے ڈائریکٹریٹ کی مشکلات کا جائزہ لینا شروع کیا' مجھے پتہ چلا کہ درجن بھر افسروں اور کوئی سو ڈیڑھ سو دوسرے افراد پر مشتمل اس ادارے کو دو بڑے مسائل کا سامنا ہے۔ ایک کمانڈر انچیف کے گھر صبح صبح اخبارات پہنچانا اور دوسرے وقت مطلوبہ پر بڑوں کو فوٹو گرافر مہیا کرنا۔ پہلے کام کے لئے ایک افسر' ایک جیپ اور ایک کلرک متعین تھے' افسر کا کام نیوز پیپر ہاکر کے ساتھ رابطہ رکھنا' گاڑی اور کلرک بھیج کر اس سے اخبارات منگوانا اور مقررہ وقت پر باس کے در دولت پر انہیں پہنچانا تھا۔ اس اپریشن کا انچارج آفیسر دوسروں سے پہلے دفتر آتا' مقررہ وقت پر سی این سی ہاؤس میں فون کرتا' ہاؤس آپریٹر یا صاحب کے بیٹ مین سے اخبارات پہنچنے کی تصدیق کرتا اور پھر اپنے سینئر کو ''اوکے'' رپورٹ دیتا اور پھر ذرا سکون سے دن کا کام شروع ہوتا۔ اگر کسی دن اخبار لیٹ آنے یا جیپ خراب ہونے کی وجہ سے ہاؤس شکایت کا فوج آ جاتا تو ڈائریکٹر صاحب سے لے کر متعلقہ افسر اور ذیلی عملے تک ہر کوئی پژمردہ ہو جاتا۔ ساری ڈائریکٹریٹ کی فضا بدل جاتی قہقہے مدھم پڑ جاتے' چہ مگوئیاں سرگوشیوں میں بدل جاتیں اور ہم جونیئر اس روز ڈائریکٹر صاحب کا سامنا کرنے سے کتراتے رہتے۔

ایک دن میں حسب معمول دیر سے دفتر آیا تو سب لوگ گم سم تھے' جس کسی سے السلام علیکم کہا اس نے ڈھیلا سا جواب دیا۔ ایک صاحب سے پوچھا۔ ''کیوں' کیا ہوا؟ کیا آج بھی اخباروں والی جیپ خراب ہو گئی؟'' اس نے کہا۔ ''نہیں ڈائریکٹر صاحب کا

چھیتا کتا مر گیا ہے' سب لوگ تعزیت کے لئے گئے ہیں تم بھی ہو آنا۔''

''ڈائریکٹر صاحب کے متعلق لوگ جو چاہیں کہیں مگر میں ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا بہت بڑا مداح ہوں' انہوں نے ابتداء میں میرے کس بل نکالنے (Grooming) جو دلچسپی لی اور مجھے جو آداب دفریت سکھائے ان کا اثر ہنوز مجھ پر موجود ہے۔ وہ خود ایک منجھے ہوئے افسر تھے اور نو وارد افسروں کو مانجھنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے' چنانچہ انہوں نے بعض اوقات فرداً فرداً اور اکثر اوقات مشترکہ طور پر مجھے اور کیپٹن احسان دانش کو مانجھنا شروع کردیا' کیپٹن دانش کی چادر ذرا پتلی تھی جلدی گھس گئی اور وہ چند سال بعد آئی۔ ایس۔ پی۔ آر کو چھوڑ کر ایجوکشن کور میں چلے گئے اور میں ذرا سخت مٹی کا بنا ہوا تھا' ڈائریکٹر صاحب کی زیر نگرانی کندن بنتا رہا جس کا مزید ذکر آگے آئے گا۔

ڈائریکٹر صاحب کی نظر عنایت ہم جونیئرز تک محدود نہ تھی' وہ نسبتاً کہنہ مشق پی آر افسروں کو بھی اپنی شفقت اور رہنمائی سے نوازتے رہتے تھے جس کی ایک مثال مجھے اس وقت یاد آرہی ہے۔

ان دنوں میجر مسعود فوٹو اور فلم سیکشن کے انچارج تھے' نہایت ملائم اور سلجھے ہوئے' دوسری جنگ عظیم کے گرگ باراں دیدہ اور مولانا چراغ حسن حسرت کے شاگرد پسندیدہ' وہ عموماً سطح سمندر کی طرح پرسکون اور مجھ جیسے جونیئرز کے لئے وجہ تقویت تھے۔ ایک دن انہیں خاصا پریشان پایا تو پوچھا کہ ''خیریت تو ہے'' کہنے لگے ''خیریت ہی ہے بس کمانڈر انچیف ہاؤس سے اے ڈی سی کا فون آیا ہے کہ آج شام بے بی (کمانڈر انچیف کی دختر نیک اختر) نے فلاور شو کا اہتمام کیا ہے اور اپنی سہیلیوں کو گارڈن پارٹی پر بلایا ہے۔ کہتے ہیں کیمرہ مین بھیج دو۔'' ''بھیج دیجئے نا'' اس میں تشویش کی کیا بات ہے؟'' ''تشویش کی بات یہ ہے برخوردار کہ ہمارے ہاں فوٹوگرافر تو کئی ہیں لیکن مووی کیمرہ مین ایک ہی ہے جس نے آج بلوچ رجمنٹ کی صد سالہ تقریبات کی کوریج کے لئے جانا ہے۔'' مجھے کوئی فوری حل نہ سوجھا اس لئے چپ ہو رہا۔ وہ یہ مسئلہ لے کر ڈائریکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ انہوں چھوٹتے ہی کہا ''میاں یونہی ساری عمر گنوا دی۔ کچھ نہیں سیکھا' سیدھی سی بات ہے' کیمرہ مین چیف ہاؤس بھیج دو۔''

''مگر سر! وہ بلوچ رجمنٹ کی صد سالہ تقریبات.......''

''چھوڑو میاں' وہ تو روز ہی صد سالہ تقریبات کرتے رہتے ہیں' بے بی کبھی کبھار ہی فلاور شو (Flower Show) کا اہتمام کرتی ہے۔ تمہیں ترجیحات کا احساس ہونا چاہیے۔''

ہمارے ڈائریکٹر صاحب کی ترجیحات بالکل درست تھیں' جس کی بنا پر وہ نہ صرف لفٹیننٹ کمانڈر کے عہدے سے ترقی کر کے

کموڈور کے رینک تک پہنچے بلکہ ڈائریکٹر کی کرسی پر متواتر تیرہ چودہ سال براجمان رہے۔ وہ شائد پھر بھی ریٹائر نہ ہوتے اگر انہیں Cento میں ڈپٹی سیکریٹری جنرل (پبلک ریلشنز) کے عہدہ جلیلہ کے لئے انقرہ نہ بھیج دیا جاتا۔ ان کے جانے پر ان کے ایک متوقع جانشین نے فرمایا "وہ بیشک ساتویں آسمان پر پہنچ جائیں لیکن ہمارے آگے کی تھوڑی سی زمین تو چھوڑ دیں۔"

آئی ایس پی آر میں معمول کا کام کوئی نہ تھا' سال بھر کی تقریبات مقرر تھیں اور ان پر جاری ہونے والے پریس ریلیز کا اسلوب بھی متعین تھا' ایک پی ایم اے کاکول کی پاسنگ آوٹ پریڈ' ایک سالانہ یوم افواج پاکستان (جو بعد میں یوم دفاع پاکستان میں بدل دیا گیا) اور سالانہ کھیل۔۔ ہم جیسا جو نوآموز بھی آتا اسے ان تقریبات سے متعلق پرانے پریس ریلیز مطالعے کے لئے دیئے جاتے تاکہ وہ اسلوب سے پوری طرح روشناس ہو جائے اور بعد میں خود ہی ان ہی خطوط پر رپورٹنگ کر سکے اور کسی قسم کی ندرت یا اپچ کی گنجائش نہ رہے۔

جب ڈائریکٹر صاحب نے سمجھا کہ میں اس کام میں طاق ہو گیا ہوں تو انہوں نے مجھے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول کی پریڈ کی کوریج کے لئے بھیج دیا اور سخت تاکید کی کہ واپسی پر پریس ریلیز کا ایک ایک لفظ مجھے دکھائے بغیر اخبارات یا ریڈیو کو جاری نہ کرنا۔۔ میں سہ پہر کو کاکول سے واپس آیا' دفتر میں بیٹھ کر پریس ریلیز تیار کیا' ان کی اجازت سے ریلیز لے کر ان کے گھر گیا' انہوں نے میری انگریزی کا ناقدانہ جائزہ لیا کہ مروجہ اسلوب سے ہٹ تو نہیں گیا' بال آخر انہوں نے میری ایک غلطی پکڑ لی۔ میں نے آخر میں لکھا تھا کہ مذکورہ تقریب میں اعلیٰ سول اور فوجی حکام نے شرکت کی' انہوں نے کہا "دیکھو غلطی کر گئے با' نئے نئے فوج میں آئے ہو' سول میں ہوتے تو یہ جملہ درست ہوتا لیکن اب تم فوج میں ہو' اب یہ جملہ یوں ہونا چاہیے کہ مذکورہ تقریب میں اعلیٰ فوجی اور سول حکام نے شرکت کی۔ میاں "اپنی ترجیحات درست رکھا کرو' سمجھے؟"

"یس سر"

"میری اپنی نوکری بھی مجھے خاصی اوکھی لگنے لگی' میرے دست و بازو کے علاوہ میرا واحد اثاثہ میری انگریزی تھی جو میں متواتر سولہ سال تک پڑھتا اور چار سال تک پڑھاتا رہا تھا لیکن یہاں آ کر یہ بھی مخدوش ہو گئی۔ میرے سینئر نے حکم دیا کہ

"تم انگریزی کا جو خط لکھو گے' پہلے ڈرافٹ کی اصلاح مجھ سے کروایا کرو گے۔" پہلے تو مجھے اس حکم پر حیرت ہوئی پھر میں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا کیونکہ فوجی ڈسپلن کے علاوہ مجھے اپنے سینئر کی عمر' مدت ملازمت اور سفید بالوں کا بھی بڑا احترام تھا' چنانچہ ہم دونوں افسر اور ماتحت کے خوشگوار رشتے میں بندھ گئے اور گاڑی چلنے لگی' لیکن جب آئے روز میری انگریزی اصلاح کی آڑ میں اس کا

حلیہ بگاڑا جانے لگا تو میورا اندر اپنی انگریزی کے متعلق احساس برتری جاگ اٹھا' میں نے ڈائریکٹر صاحب سے گزارش کی کہ اول تو بیچاری پردیسی زبان انگریزی پر (جس کے سرپرست واپس جا چکے ہیں) یہ ظلم وستم دیکھ کر میرا جی کڑھتا ہے پھر اس پر یہ اصرار کہ اصلاح شدہ خط پر میں دستخط کروں میرے لئے ناقابل برداشت ہے جان بوجھ کر غلط انگریزی پر دستخط کرنا اتنا ہی بڑا جرم ہے جتنا قتل عمد۔ ڈائریکٹر صاحب نے مدعی اور مدعا علیہ کے دلائل سننے کے بعد فیصلہ صادر فرمایا کہ میں حسب معمول ڈرافٹ لیٹر ٹائپ اپ کرتا رہوں گا' میرے سینئر حسب معمول اس میں ''اصلاح'' فرماتے رہیں گے اور اگر مجھے ان کی اصلاح سے اتفاق نہ ہوا تو وہ خود اس پر دستخط فرمایا کریں گے۔''

دیکھئے ہم نے انگریزی کی خاطر کیا کیا لڑائیاں لڑیں پھر بھی انگریز کہتے ہیں کہ ہم وفادار نہیں'

دراصل یہ سارا قصور پروفیسر حمید احمد خاں کی پیوری ٹن ٹریننگ (Puritan Training) کا تھا جنہوں نے ہمیں سکھایا تھا کہ زبان کی عصمت کو کسی قیمت پر قربان نہ کرنا۔ ان کا سکھایا ہوا دوسرا گر یہ تھا کہ عموماً اپنا منہ بند رکھو لیکن اگر کوئی کسی مسئلے کے بارے میں رائے پوچھ بیٹھے تو ہرگز لحاظ نہ کرنا اور بلا جھجک اور بے دھڑک اپنی ایماندارانہ رائے کا اظہار کرنا ورنہ تم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں گنہگار اور خود اپنے ضمیر کے سامنے مجرم ہوگے۔ مجھے آئی ایس پی آر میں آئے بمشکل چند ماہ ہوئے تھے کہ ہمارے ایک میجر صاحب نے فوجی ڈپو سے ایک فرسودہ جیپ مبلغ بارہ سو روپے میں خرید لی۔ کباڑی بازار سے کچھ پرزے خرید کر اس میں ڈلوائے اور نئی پوشش چڑھوائی اور بنا سنوار کر جیپ دفتر کے سامنے کھڑی کر دی۔ میں کہیں باہر سے اپنی پانچ سو روپے کی نئی سائیکل پر واپس آیا تو سارے افسروں کو جیپ کے ارد گرد پایا۔ پتہ چلا کہ جیپ کی قیمت لگائی جا رہی ہے' میں خاموش کھڑا سنتا رہا' بالآخر کسی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ ''کیا خیال ہے سالک صاحب؟ کتنے میں خرید لیں گے آپ یہ جیپ۔'' میں نے بے ساختہ عرض کیا ''میں تو اسے اس سائیکل کے بدلے بھی قبول نہ کروں۔'' اس پر جیپ کے مالک مجھ پر اتنے خفا ہوئے کہ اپنی ریٹائرمنٹ تک خفا ہی رہے۔ اس واقعہ کے بعد ایک اور صاحب نے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے فوج میں تمہارے دن تھوڑے ہیں' اگر تم ذرا بھی سمجھ دار ہوتے تو کہتے کہ اگر اور لوگ دس ہزار روپے کی بولی دے رہے ہیں تو میں پندرہ ہزار میں خریدنے کو تیار ہوں۔ ایسی نادر اشیاء روز روز کہاں ہاتھ آتی ہیں۔''

اس مخاصمانہ ماحول میں میری اور کیپٹن دانش کی گاڑھی چھنتی تھی' وہ نسلاً پٹھان اور طبعاً درویش صفت تھے۔ اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ فیملی پلاننگ پر بالکل یقین نہ رکھتے تھے' مجھے بھی وہ اکثر وعظ فرماتے رہتے تھے مگر میں ان کی نسبت زیادہ دنیادار واقع ہوا تھا۔

دانش صاحب نے دفتر میں دوست پال رکھے تھے اور گھر پر مرغیاں' وہ دونوں کا بہت خیال رکھتے تھے' دوستوں کے لئے مرغیاں قربان کر دیتے تھے اور مرغیوں کے لئے سرکاری احکام۔ مثلاً ایک مرتبہ انہوں نے اس لئے مکان بدلنے سے انکار کر دیا کہ ان کی تین مرغیاں بیک وقت تین مختلف کمروں میں انڈوں پر بیٹھی تھیں اور ان کا موقف یہ تھا کہ اگر ایک روز سے پہلے انہیں اٹھا دیا گیا تو سارے انڈے بیکار ہو جائیں گے۔ میں نے آج تک اتنا' خدا ترس دوست نواز اور مرغی پرست شخص نہیں دیکھا۔

میری اور ان کی دوستی دو مستقل بنیادوں پر قائم تھی' ایک یہ کہ ہم دفتر میں سب سے جونیئر تھے اور ہر کسی کی افسری کا نشانہ بنتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہم دونوں ڈائریکٹر صاحب سے مشترکہ طور پر۔۔ اور مساوی مقدار میں۔۔ ڈرتے تھے۔ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی طرح باس میں کیا لچک دی تھی کہ وہ جتنا زم بولتے تھے' ہم ان سے اتنا ہی دبک جاتے تھے' ایک تو جھاڑ پلانے کا معروف طریقہ ہے کہ سینئر نے جونیئر کو بلوایا' اٹینشن کیا' اونچی اور غصیلی آواز میں دو تین مرتبہ غلط سلط انگریزی بولی اور اپنا غصہ ٹھنڈا کر لیا۔ لیکن وہ یہ عامیانہ رویہ نہیں اپناتے تھے۔ وہ نہایت محبت سے دفتر میں بلواتے' بھویں (اپنی) سکیڑ کر اوپر کر لیتے' تھوڑی سی معکوس گردش آنکھوں کو دیتے اور معتوب کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر نہایت ملائم لہجے میں کہتے ''دیکھو نا'' یہ کوئی طریقہ ہے نوکری کرنے کا' جیپ لے کر ایسے نکلے کہ چھٹی تک لوٹنے کا نام نہیں لیا' ہم انتظار کرتے رہ گئے۔ میاں' جب ہم تمہاری سطح پر تھے اپنے سینئرز کے سامنے تھر تھر کانپا کرتے تھے۔''

ان کی باتیں سن کر ہم بھی تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

طبیعت کے اتنے ملائم تھے کہ کسی کو اونچی آواز میں جھاڑ پلانا تو درکنار اونچی آواز یا شور میں سلیوٹ لینا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مشہور کرکٹر میجر شجاع الدین بٹ انہیں ملنے آئے وہ بلوچ رجمنٹ کے پکے رجمنٹل سولجر تھے' جنہوں نے فوج کا رگڑا کھا کر کمیشن پایا تھا اور فوج کا گرم و سرد چکھ کر میجر کے فیلڈ رینک تک پہنچے تھے (وہ بعد میں لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں ریٹائر ہوئے) وہ جب تشریف لائے تو میں ڈائریکٹر صاحب کے حضور خاموش کھڑا تھا اور ان کی سکھلائی کے مطابق بلا وجہ کانپ رہا تھا۔ اتنے میں میجر بٹ نے عمر بھر کی سکھلائی کو بروئے کار لاتے ہوئے چھڑی بغل میں دبائی' یکے بعد دیگرے بھاری بوٹوں کو ٹھک ٹھک زمین پر مارا اور زوردار سلیوٹ داغ دیا' اتنا زوردار کہ فرش کانپ گیا' ڈائریکٹر صاحب نے کاغذوں سے نظر اٹھائی اور دھیمے لہجے میں بولے۔

''میاں! کیوں فرش توڑتے ہو' ہم سے کام ہے تو سلیقے سے بیٹھو ٹوپی اتارو' پنکھے کی ہوا لو۔ میں ابھی تمہاری بات سنتا ہوں۔''

اس کے بعد وہ میجر شجاع الدین بٹ کی بات سننے لگے اور میں موقع پا کر باہر کھسک گیا۔

میں پرانا پاپی نہ سہی لیکن کیپٹن دانش پرانے زاہد و درویش تھے۔ وہ نہ صرف حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھتے تھے بلکہ روحانی رہنمائی اور دفع آفات کے لئے پیروں فقیروں کی آخری آرامگاہوں اور درویشوں کے آستانوں پر بھی جاتے رہتے تھے' ایک دن میں نے معمول کی Cribbing کے دوران کیپٹن دانش سے کہا کہ ''وہ کسی پیر فقیر سے کوئی ایسا نسخہ یا تعویز لے آئیں کہ ہم دونوں کی ناکردہ خطائیں معاف ہو جائیں اور ہمارے افسر خاص کر ڈائریکٹر صاحب ہم پر مہربان ہو جائیں' انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ کوشش کریں گے۔ چند روز بعد وہ ایک وظیفہ لے آئے اور اس کی ترکیب استعمال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ جونہی بلاوا آئے اپنے کمرے سے قدم باہر رکھنے سے لے کر باس کے کمرے میں داخل ہونے تک درمیانی فاصلے میں جتنی مرتبہ ممکن ہو' اس وظیفے کا ورد کر لیا جائے تو باس کا دل موم ہو جائے گا۔ میں نے ایک آدھ آیت پر مبنی یہ وظیفہ ازبر کیا اور حسب ضرورت اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن ایک بہت بڑے آفیسر باہر سے ہمارے ڈائریکٹر صاحب کے پاس تشریف لائے۔ ان کے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد زوردار گھنٹی بجی اور ڈائریکٹر صاحب کا چپڑاسی (دفعدار مشتاق) زوردار رفتار سے میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''ڈائریکٹر صاحب یاد کر رہے ہیں' ان کے پاس ایک بہت بڑا افسر بیٹھا ہے۔ کہہ رہے ہیں فوراً بلاؤ''۔ میں جلدی جلدی اٹھا' وظیفے کا سہارا لینا چاہا لیکن وہ بروقت یاد نہ آیا۔ میں غیر مسلح حالت میں ہی پیش ہو گیا اور جھاڑ کھا کر واپس آ گیا۔

بعد میں' میں نے کیپٹن دانش سے اپنی بے بسی کا ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا وظیفے سے اس کو آفاقہ ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ''نہیں'' پوچھا کیا تمہیں وقت پر وظیفہ یاد نہیں رہا۔'' اس نے جواب دیا کہ وظیفہ تو یاد تھا لیکن جب میں اندر پیش ہوا تو ڈائریکٹر صاحب کے پاس ایک خونخوار قسم کا افسر بیٹھا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ وظیفہ پڑھا لیکن بے اثر رہا' شاید وظیفہ ایک افسر کے لئے تھا' بیک وقت دو افراد پر اثر نہیں کرتا' میں پھر پیر صاحب کے پاس جاؤں گا۔''

یوں تو جھاڑ (پونچھ) کی وجوہات تلاش کرنا عبث ہے کیوں کہ نادر شاہ ابدالی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اپنے مشیروں کو بلا کر کہا کرتا تھا کہ ''ہم نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے' لہٰذا اس کے لئے ضروری وجوہات تیار کرو' لیکن باس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وجوہات تیار کرے کیونکہ He Owes Explanation to None (یعنی وہ کسی (جونیئر) کو جواب دہ نہیں ہوتا)

لہٰذا بوجہ یا بلاوجہ ہماری پیشی ہوتی رہتی' شروع میں پیشی کی بڑی وجہ پریس ریلیز ہوتی تھی' جس میں بقول ان کے سویلین رپورٹنگ کی بوزیادہ اور عسکری مہک کم آتی تھی' اس پر ذرا قابو پایا تو ڈسپلے(Display) پر جھاڑ پڑنا شروع ہوگئی مثلاً

''دیکھو نا' میاں' تم نے سٹوری تو لکھ لی' اسے اخبارات میں کون چھپوائے گا۔''

''جی چھپی ہوئی تو ہے۔''

''اسے تم چھپنا کہتے ہو' چیف کی سٹوری ہے اور صفحہ ۵ پر چلی گئی ہے معلوم ہوتا ہے تمہارا پی آر کمزور ہے' شام کو جایا کرو نا' اخبارات میں' دوستی بناؤ''

''ٹھیک ہے' سر''

اگر سٹوری اندر کے صفحات سے نکل کر پہلے آخری صفحے تک جاتی تو کہتے۔

''دیکھو نا' سنگل کالم ڈسپلے بھی کوئی ڈسپلے ہوتا ہے' فرنٹ پیج کافی نہیں' ڈسپلے اچھا ہونا چاہیئے' معلوم ہوتا ہے تمہارا پی آر کمزور ہے' شام کو جایا کرو نا' اخبارات کے دفتروں میں.......''

میں نے بعد میں ایک پرانے رفیق کار سے پوچھا کہ آیا ان کے ساتھ بھی یہی ہوتا آیا اور آیا باس ڈسپلے سے کبھی مطمئن بھی ہوئے ہیں' انہوں نے فرمایا۔

''فکر مت کرو' ہم سب ان جھاڑوں کے سائے تلے پل کر بوڑھے ہوئے ہیں' یہ صاحب با آسانی ڈسپلے سے مطمئن نہیں ہوتے بس ایک مرتبہ ہوئے تھے۔''

''وہ کب''

''۱۹۵۳ء کے مارشل لاء میں سپیشل ملٹری کورٹ نے جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو سزائے موت سنادی تھی اور اگلے روز تمام اخبارات میں یہی شہ سرخی تھی' اس پر انہوں نے خوش ہوکر فرمایا تھا دیکھو نا' اب بات بنی' کیسا عمدہ ڈسپلے ملا ہے پریس ریلیز کو''

''بہت آسان نسخہ ہے''

''وہ کیا؟

''چیک اپ''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

فرمانے لگے ''چیک اپ ایک انگریزی ترکیب ہے۔ جو فوج میں دافع بلا کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب سنیئر کوئی سوال پوچھے' کوئی الزام لگائے یا جواب طلب کرے تو کہہ دو Sir I will Check Up' وہ خود بخود خاموش ہو جائے گا۔''

پھر انہوں نے پہلی جماعت کے بچے کی طرح مجھے یہی بات مثالیں دے دے کر سمجھائی یعنی اگر باس پوچھے کہ ''کل جیپ کا ایکسیڈنٹ کیسے ہو گیا' تو جواب۔ سر! آئی ول چیک اپ'' وہ کہے ''چیف کی فوٹو سب اخباروں میں کیوں نہیں چھپی'' جواب۔ ''آئی ول چیک اپ'' وہ پوچھے ''آج دفتر دیر سے کیوں کھلے'' جواب۔ ''آئی ول چیک اپ''

میں نے اس نسخے کے سہارے اپنی ملازمت کے ابتدائی سال بخیر و عافیت گزار لیے۔

◆◆◆

کپتان کی واپسی

آئی ایس پی آر کی نوکری میں ایک راحت یہ بھی تھی کہ اندرون ملک چھوٹے موٹے دوروں کی گنجائش نکلتی رہتی تھی۔ جب دفتری ماحول کثیف ہونے لگتا تو تازہ ہوا لینے کے لئے کسی نہ کسی چھاؤنی کی طرف نکل جانے کا موقع مل جاتا اور سچ پوچھے تو زمانہ امن میں فوج کی سج دھج دیکھنی ہو تو چھاؤنی میں اور معرکہ حق و باطل میں اس تیور ملاحظہ کرنے ہوں تو محاذ جنگ پر....... اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دفتری نوعیت کی نوکری کے باوجود مجھے فوج کے یہ دونوں رخ دیکھنا نصیب ہوئے۔ اس باب میں زمانہ امن کے دو تین دوروں کا ذکر ہے اور اگلے صفحات میں مناظر جنگ کا تذکرہ!

میری حیثیت ایک نومولود کپتان سے زیادہ نہ تھی کہ مجھے عارضی ڈیوٹی پر سیالکوٹ چھاؤنی بھیج دیا گیا جہاں پنجاب رجمنٹ کی ایک شہرہ آفاق پلٹن اپنے ایک سپوت لانس نائیک شیر شاہ شہید کی یاد منا رہی تھی اور اس موقع پر اسے قومی پرچم بھی عطا کیا جا رہا تھا۔ پرچم دینے والے چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل آغا محمد یحیٰی خاں تھے۔ پرچم لینے والے ۲ پنجاب کے جوان تھے اور یہ روح پرور منظر دیکھنے والوں میں میجر جنرل اختر حسین ملک سے لے کر میجر راجہ عزیز بھٹی تک پنجاب رجمنٹ کے کئی سینئر اور جونیئر آفیسر موجود تھے۔ میری حیثیت ایک آبزرور اور وقائع نگار کی تھی۔

فوج میں پرچم دینے کی روایت بہت قدیم ہے۔ انگریزوں نے پتہ نہیں کیوں اور کیسے یہ رسم شروع کی لیکن ہمارے لئے تاریخ اسلام میں اس کا جواز موجود ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ غزوہ خیبر کے موقع پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو پرچم عطا کیا تھا یہی پرچم اسلام اور اسلامی لشکر کی سربلندی اور عظمت کی علامت بن گیا تھا۔ اگرچہ دور حاضر میں فوجی دستے پرچم اٹھا کر میدان جنگ میں مارچ نہیں کرتے تاہم اس کے پیچھے ہر قیمت پر اپنی رجمنٹ کی سربلندی اور عظمت کے لئے سینہ سپر ہونے کا جو جذبہ کارفرما ہے وہ آج بھی زندہ ہے۔ اور میدان کارزار میں داخل ہونے والوں کے لئے جذبۂ ہمت اور تقویت کے ایک عظیم سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے تقریب سے ایک دن پہلے سیالکوٹ بھیج دیا گیا تاکہ میں تقریب کی تیاریوں کا جائزہ لے سکوں اور اس کا آنکھوں دیکھا حال لکھنے کے لئے اس کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر لوں۔ میں نے اسے ادائیگی فرض کے علاوہ اس لئے بھی غنیمت جانا کہ اس

طرح مجھے ڈائریکٹریٹ کے چوہے زدہ ماحول سے دور جانے اور فوج کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

راولپنڈی سے سیالکوٹ جاتے ہوئے کھاریاں راستے میں پڑتا ہے جو میرا آبائی علاقہ ہے۔ میں سرکاری جیپ پر وہاں سے گزرنے لگا تو پتہ نہیں جی میں کیا آئی کہ گاڑی کا رخ اپنے گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ ایک بے قاعدگی ہے اور اسے ٹرانسپورٹ کا ناجائز استعمال (Misuse of Transport) کہا جائے گا اور مجھے اس بات کا علم تھا کہ بہادری کے ایسے کارنامے انجام دینے کے لیے اعلیٰ رینک اور طویل مدت ملازمت ہونی چاہیے لیکن میں اپنی کپتانی کے نشے میں اس بحر ظلمات میں کود پڑا تھوڑی دور گیا تھا کہ گاڑی برساتی نالے میں پھنس گئی میں سمجھا کہ میں پھنس گیا' اب ضروری تفتیش ہوگی کہ میں راہ راست سے کیوں ہٹا' سیالکوٹ چھاؤنی کو جانے والا یہ راستے میں نے کب اور کیسے دریافت کیا۔ میں نے کوشش کی کہ یہ راز میرے اور ڈرائیور کے درمیان رہے اور ہم اپنی بے قاعدگی پر چپکے سے قابو پالیں لیکن جیپ تھی کہ دلدل میں دھنسی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ بطخ کی طرح اپنے پیٹ کے بل دلدل پر بیٹھ گئی۔

میں نے مدد کے لئے ارگرد نگاہ ڈالی تو آبادی کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ ڈرائیور نے دور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف ایک فوجی خیمہ دیکھا اور اس کے قریب کسی ٹینک یا توپ پر کیموفلاج نیٹ تنا ہوا پایا۔ میں ڈرائیور کو جیپ کے پاس چھوڑ کر خیمے کی طرف چل دیا۔ جان نہ پہچان میں تیرا مہمان! میں وہاں پہنچا تو میجر صاحب کیمپ سٹول پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے میں نے حسب توفیق انہیں بہترین سلیوٹ کیا' اپنا تعارف کرایا اور مختصراً اپنا مسئلہ بیان کیا۔ وہ ایسے تپاک سے ملے گویا بچپن کے دوست ہوں' انہوں نے میرے لئے ایک اور کیمپ سٹول منگوایا۔ کہا ''تشریف رکھیے' نو پرابلم (No Problem)'' پھر انہوں نے چار پانچ فوجیوں کی ایک پارٹی جائے وقوعہ کی طرف روانہ کی' مجھے ایک چھولداری میں واش' کرنے کی دعوت دی اور جب میں ہاتھ منہ دھو کر نکلا تو فوجی مگ میں گرم گرم چائے اور پکوڑے تیار تھے۔ ہم دونوں نے عیش وعشرت کی' چائے پی' گپ شپ لگائی اور دوستی پکی کی۔ اتنے میں فوجی پارٹی اپنا کام کر دکھایا وہ میری جیپ چلاتے ہوئے کیمپ میں آ گئے۔

میری جان میں جان آئی' پارٹی کی کارکردگی اور میجر صاحب کی میزبانی پر رشک آیا اور میں نے ابتدائے ملازمت میں ہی فوج کا یہ پہلو حرز جاں بنا لیا کہ یہ ایک فیملی ہے جہاں ہر کوئی دوسرے فرد خانہ کے پاس' کسی تعارف یا سفارش کے بغیر جا سکتا ہے اور ہمیشہ اسے تعاون ملتا ہے۔ یہ خوبی بہت کم اداروں میں پائی جاتی ہے۔

میں گاؤں پہنچا تو تہلکہ مچ گیا' تہلکہ کی ایک وجہ تو فوجی جیپ تھی جو غالباً دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلی مرتبہ گاؤں کی کچی

پگڈنڈیوں پر دیکھی گئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس جھلکے کا اصل سبب میری کپتانی تھی کیونکہ صدیوں کے انتظار کے بعد اس گاؤں کا پہلا کپتان آج اپنے آبائی گاؤں میں داخل ہوا تھا۔لوگوں نے گاؤں کے باہر ہی مجھے روک لیا' مردوں نے بغلگیر ہونا شروع کر دیا' چاچیوں اور ممانیوں نے چومنا اور سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا' گھر پہنچا تو والدہ نے بوسے اور دعائیں نچھاور کیں' ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے انہوں نے اشک آلود آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے میری کندھے کو چھوا اور کہا'' بیٹا شکر ہے تمہاری محنت ٹھکانے لگی یہ بتا کہ کیا تجھ سے بڑے افسر بھی ہیں اور آیا وہ تم سے زیادہ جماعتیں پڑھے ہوئے ہیں''میں نے ماتا کے تجسس کو تسکین دینے کے لئے عرض کیا'' کہ افسر تو شائد کچھ اوپر بھی ہوں گے۔لیکن وہ تمہارے بیٹے سے زیادہ پڑھے لکھے نہیں۔''انہوں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے گھر کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم مہمانوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔دودھ لسی اور شربت کے دور چلنے لگے۔اندر پوچھے بغیر چائے چولہے پر ابلنے لگی' کرسیاں کم پڑ گئیں تو چارپائیاں بچھا دی گئیں۔بچے بالے جو کرسیوں یا چارپائی پر بیٹھنے کے اہل نہ تھے' دروازے کی چوکھٹ سے لگ کر جھانکنے لگے کہ کپتان کیسا ہوتا ہے • باہر ایک چھوٹی سی ٹولی ڈرائیور کی خاطر تواضع میں لگی ہوئی تھی اور اسے چائے پانی پلانے کے ساتھ ساتھ اس سے فوجی موضوعات پر بات چیت بھی کر رہی تھی۔لمحے بھر کو مجھے خیال گزرا کہ کہیں اس سے میری کپتانی کے راز تو نہیں پوچھے جا رہے' پھر خود ہی دل کو تسلی دے ڈالی کہ وہ تو کسی فوجی یونٹ سے مستعار لیا ہوا ڈرائیور ہے اسے کیا معلوم کہ میں اصلی کپتان ہوں یا نقلی' کرید کر کون دیکھتا ہے' بظاہر مجھ میں ایک پکے کپتان کی ساری نشانیاں پائی جاتی تھی'' کم از کم ۳۲ انچ چھاتی ستواں قد' کسرتی جسم' استری شدہ وردی' وردی پر پھول' پھولوں پر چمک اور چہرے پر دمک۔اور کیا چاہیے؟

میں اجازت لے کر چلنے ہی والا تھا کہ چچا احمد خان گرد میں اٹا ہوا آ دھمکا' جس پھرتی سے وہ آ رہا تھا لگتا تھا کہ سیدھا میرے سینے سے ٹکرائے گا' لیکن ایک سابق فوجی ہونے کی وجہ سے چند قدم دور رک گیا۔خوب اٹینشن ہو کر سیلوٹ کیا' پھر آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا۔گاؤں سے باہر کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے دیر سے پہنچنے کی معذرت کی پھر اس کی نظریں میرے سراپا کا جائزہ لیتی ہوئی میری کپتانی پر آ کر رک گئیں۔ہر کندھے پر تین تین پپ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''ہن گل ہوئی نا'' (اب بات بنی نا)

اس نے مجھ سے بہت سے سوال پوچھنا چاہے مثلاً کون سے یونٹ میں گئے ہو' ٹریننگ کتنے عرصے کی تھی' زیادہ سخت تو نہیں تھی۔

Weapon Training Filedoraft, اور Quarterguard Duty کا کیا عالم تھا۔ میں عدم فرصت کا بہانہ کر کے ان سوالوں کے جوابات ٹال گیا اور سیالکوٹ چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

سیالکوٹ چھاؤنی' چھاؤنیوں کی برادری میں کوئی اونچا مقام نہ رکھتی تھی لیکن پھر بھی عام شہری آبادیوں سے کہیں زیادہ صاف ستھری اور منظم تھی۔ میں جونہی سیالکوٹ شہر سے گزر کر چھاؤنی کی حدود میں داخل ہوا تو ایک واضح فرق محسوس ہوا۔ وہی فرق جو شب تار گزار کا طلوع آفتاب کی پہلی کرنوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ چھاؤنی کی حدود کے اندر ہر یونٹ کی اپنی حدود تھیں۔ ہر یونٹ پر چونے اور گیری کا لیپ اور اس پر رجمنٹل کلر میں کھینچی ہوئی لکیریں! صاف پتا چلتا تھا کہ یہاں پنجاب رجمنٹ کی پلٹن ہے' یہاں بلوچ رجمنٹ کی' یہاں فرنٹیئر فورس اور یہاں آزاد کشمیر رجمنٹ اسی طرح یہاں توپ خانہ ہے' یہاں رسالہ ہے۔ یہاں سپلائی کا محکمہ ہے اور یہاں سگنلز کا۔ ہر یونٹ کے گیٹ پر سنتری' گیٹ کے اندر چمک دمک کوارٹر گارڈ' کوارٹر گارڈ پر مستعد اور چوکس گارڈ۔ میں جس جس یونٹ کے سامنے سے گزرا۔ کمانڈر نے بلند آواز میں سلیوٹ کا کاشن دیا اور سنتری نے پوری آب و تاب کے ساتھ رائفل کی کھنا کھن سمیت ایسا زوردار سلیوٹ کیا کہ پہلے تو میرا دل دہل گیا پھر میں نے حوالدار رفیق کی سکھلائی کے مطابق اپنی طرف سے خاصا سمارٹ جوابی سلیوٹ کیا۔ میں اب ایبٹ آباد والا نو وارد کپتان نہ تھا جو سلیوٹ کے جواب میں ہاتھ ہلا ہلا کر آداب عرض کرتا جاتا۔ میں اب پکا کپتان تھا اور ایک چھاؤنی کے علاقے سے گزر رہا تھا۔

میں جس یونٹ (۲ پنجاب) کا مہمان تھا اس کے بہت سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ جن میں میجر جنرل یحییٰ خاں اور میجر جنرل اختر ملک سے لے کر میجر عزیز بھٹی تک شامل تھے۔ رہائش کے لئے میری باری ایک آرٹلری آفیسرز میس میں آئی میرے پہنچتے ہی میس حوالدار نے میرا استقبال کیا پہلے سے تیار اردلی نے جیپ سے میرا اسامان اتروایا۔ مجھے اپنا کمرہ دکھایا' میس ویٹر کو چائے لانے کو کہا اور خود میرا اسامان اتروایا۔ میں نے مصروف عمل دیکھ کر دل میں سوچا کہ فوج میں اردلیوں کی خاصی فراوانی لگتی ہے۔ ایک اردلی مجھے میکے (ایف ایف سنٹر) سے ملا تھا جو میری فیملی کے لئے اس وقت روالپنڈی میں سبزی گوشت خرید رہا ہوگا۔ یہاں ایک اور اردی میزبانوں نے فراہم کر دیا ہے۔ کہیں اسراف کا شکار تو نہیں ہو رہا۔ اتنے میں ایک واقف کار نے بتایا کہ اردلیوں کی کوئی کور (Corrs) نہیں ہوتی وہ پیشہ ور سپاہی ہوتے ہیں جو بوقت ضرورت بیٹ مین کی ڈیوٹی کرتے ہیں اور وقت پڑنے پر اپنے پیشہ ورانہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

اگلی صبح کو تقریب تھی جس کی اپنی سن دھج تھی' جائے تقریب کی طرف تمام راستوں پر مہمانوں کی راہنمائی کے لئے بورڈ آویزاں

تھے۔''یوم شیر شاہ (اس طرف) اور کلیدی چوراہوں پر رجمنٹل پولیس (آر۔پی) کے سپاہی متعین تھے جو ٹریفک کانسٹیبل سے کہیں زیادہ پھرتی اور مستعدی سے صحیح راستے کی طرف راہنمائی کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے بتائے ہوئے روٹ پر چلتا ہوا ۲ پنجاب کی گراونڈ میں پہنچ گیا۔ جیپ جنرل پارک میں چلی گئی اور میں عام مہمانوں کے مخصوص حصے میں بیٹھ گیا' پریڈ پہلے ہی تیار تھی۔ مہمان خصوصی آئے۔ سلامی لی۔ پریڈ کا معائنہ کیا۔ تقریر میں شیر شاہ کے حوالے سے پلٹن کی تعریف کی' مہمانوں نے تالیاں بجائیں' بینڈ نے فضا میں دھنیں بکھیریں اور کوئی دو گھنٹے بعد یہ رنگا رنگ تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

اصل ہنگامہ رات کو تھا جب ''بڑے کھانے'' کے بعد ایک کلچرل پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ دونوں تجربے میرے لئے نئے تھے' بڑے کھانے کی روح یہ ہوتی ہے کہ یہ ضیافت بنیادی طور پر سپاہیوں کے لیے ترتیب دی جاتی ہے۔ لیکن تمام آفیسر بھی اس میں شریک ہوتے ہیں اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں' مجھے اسلامی اخوت کی یہ مثال بہت پسند آئی' میں نے بھی ایک بنچ پر بیٹھ کر ما حضر تناول کیا۔ رات کو ثقافتی شو ہوا' یہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے پہلے کا واقعہ ہے جب فوج کا رنگ کچھ اور ہوتا تھا۔ اس کی تقریبات میں گانے والیاں بھی آتی تھیں اور شراب بھی خوب چلتی تھی۔ چنانچہ یہ محفل رقص و سرور خاصی ہنگامہ پرور تھی۔ میں نے اس تقریب میں پہلی مرتبہ لوک فنکار سائیں اختر کو سنا جو شراب کے نشے میں عارفانہ کلام اس جذب و کیف کے ساتھ گا رہا تھا کہ بعض لوگوں پر ''حال'' پڑنا شروع ہو گیا تھا۔

اس تقریب کے بعد جنرل یحییٰ خان' جنرل اختر ملک اور دوسرے افسروں نے جام و سبو کے ساتھ خوب انصاف کیا' شراب نے اپنا اثر بھی دکھایا اور بہت سے لوگوں نے ایسے نعرے لگائے جو وہ عام حالات میں ہرگز نہ لگاتے لیکن ان میں سے کوئی مدہوش ہو کر قالین پر گرا نہ کسی کو الٹی آئی' کسی نے ابکائی کی نہ کسی کو گالی دی۔ پھر بھی محفل پر رقص و شراب کا اثر غالب رہا! آج پچیس برس بعد اس محفل کو یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ ہماری فوج اس ماحول سے کتنی آگے آ چکی ہے۔ اب یہاں شراب کا تصور تک ممنوع ہے۔ لوگ شلوار کرتے پر واسکٹ پہنتے ہیں اور نماز کے لئے سفید ٹوپی جیب میں رکھتے ہیں۔ اگر آج جنرل یحییٰ خان زندہ ہوتے تو پتہ نہیں وہ اپنے آپ کو کتنا Out of Place محسوس کرتے۔

اگلی صبح سبھی دیر سے اٹھے' نہائے دھوئے ناشتے کی میز پر پہنچے تو یوں دھلے دھلے لگ رہے تھے جیسے مچھلی پانی سے نہا کر نکلتی ہے' وہیں ناشتے کی میز پر میری ملاقات میجر جنرل اختر حسین ملک سے ہوئی' انہوں نے تعارف میں پہل کی۔ میری ذات میں گہری دلچسپی لی اور کئی سوالات پوچھے یعنی کتنی تعلیم پائی' فوج میں کب آئے' فوج کیسی لگی' پی آر کا محکمہ کیسا ہے؟ وغیرہ! وہیں ناشتے کی میز پر انہوں

نے انکشاف کیا کہ وہ اپنی سٹاف کار میں روالپنڈی جارہے ہیں وہ ان دنوں مری میں جی او سی تھے)انہوں نے مجھ سے کہا۔

Capt. Salik! Would you Like to Give Me the Pleasure of your Company Upto Rawalpindi?

(کیپٹن سالک! کیاراولپنڈی تک آپ مجھے اپنی محبت سے نوازیں گے)

میں نے سوچا یہ جرنیل خاصا غیر روایتی قسم کا ہے کیونکہ ابھی تک فوج کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ یہاں رینک اور سنیارٹی اور کا احساس ہر چیز پر غالب رہتا ہے۔کوئی جونیئر کسی سینئر سے بے تکلفی کی جرات نہیں کرسکتا۔اور کوئی سینئر کسی جونیئر کو منہ نہیں چڑھا سکتا' بلکہ ایک ہی رینک میں سینئر اور جونیئر کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ سینئر اپنے جونیئر کی زندگی حرام کرسکتا ہے۔یہاں ایک نہایت سینئر میجر جنرل ایک نہایت ہی جونیئر کیپٹن کی ہمسفری کی دعوت دے رہا تھا۔میں نے سوچا ایک جنرل کو ممنون کرنے کا اچھا موقع ہے لہٰذا ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

راستے میں وہ مجھ سے میرے پیشے کے متعلق باتیں کرتے رہے مثلاً آج کل کون سے جاپانی کیمرے مقبول ہیں اور وہ جرمن کیمروں کے مقابلے میں کیسے ہیں۔مووی کیمرہ کونسا اچھا ہے۔اور اس میں کیسے کیسے لینز (Lens) آرہے ہیں۔پھر اسی حوالے سے انہوں نے جنگی وقائع نگار (War Correspindents) اور جنگی فلموں (War Movies) کا ذکر چھیڑ دیا اور مجھے اعتراف ہے کہ ان تمام موضوعات پر ان کی معلومات مجھ سے کہیں زیادہ جدید اور معتبر تھیں (مجھے شک ہونے لگا کہ یہ شخص کہیں آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر نہ بن جائے)

میں ایک عرصے تک اس سفر کے نشے میں رہا اور کئی دوستوں سے جنرل اختر ملک کی گفتگو اور وسیع معلومات کا ذکر کرتا رہا۔

مجھے آئی ایس پی آر کے گڑھے میں لوٹے بمشکل چند روز ہوئے تھے کہ ایک اور دورہ نکل آیا۔اس کا رخ آزاد کشمیر کی طرف تھا' ہوا یوں کہ اقوام متحدہ کی طرف سے ایک ٹیم آئی۔جو کشمیر کے پس منظر میں ایک فلم بنانا چاہتی تھی' اس کا سیاق وسباق یہ بتایا گیا کہ امریکی انتظامیہ پر امریکی ٹیکس دہندگان کی طرف سے یہ دباؤ ہے کہ امریکہ کیوں ہر سال ایک خطیر رقم اقوام متحدہ کے فنڈ میں دیتا ہے جب کہ اقوام متحدہ بحالی امن کے بارے میں جو اس کا بنیادی مقصد ہے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کررہی۔اس کا جواب یہ سوچا گیا کہ اقوام متحدہ کے Peace Keeping Role پر ایک فلم بنائی جائے جو امریکی عوام پر بالخصوص اور دیگر اقوام پر بالعموم اقوام متحدہ کی افادیت واضح کرسکے۔اس مقصد کے لئے جو Locale منتخب کیا گیا وہ کشمیر کا تھا یعنی ان کی نظر میں اگر ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۴ء تک کشمیر میں ٹھس ٹھس کے علاوہ کوئی باقاعدہ لڑائی نہیں ہوئی تو اس کا کریڈٹ اقوام متحدہ کو ہی جاتا ہے جس کے مبصرین سیز

فائر لائن کے دونوں طرف تعینات ہیں۔

اس پانچ رکنی ٹیم میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے جن میں دو کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ایک اسکرپٹ رائٹر تھے ''یوجین برڈک جو اپنی کتاب ''The Ugly American'' کے مشترکہ مصنف (Cot Author) کے طور پر بہت مشہور ہوئے تھے اور دوسرے تھے مشہور فلم ڈائریکٹر ڈیوڈ لین جنہوں نے ہائی گراس اور Bridge on the River Kawai جیسی لافانی فلمیں ڈائریکٹ کی تھیں۔اس ٹیم نے آزاد کشمیر کے شمال سے لے کر جنوب تک سیز فائر لائن کے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا اور فلم بنانے کے امکانات کا جائزہ لینا تھا۔ مجھے اس ٹیم کے ساتھ جی ایچ کیو کی طرف افسر رابطہ قائم کیا گیا۔اور در پردہ یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ ذرا خیال رکھنا یہ واقعی فلم بنانے آئے ہیں یا فلم کے پردے میں کسی اور مشن پر ہیں۔

اس ٹیم نے جی ایچ کیو کی بریفنگ کے بعد اپنے دورے کا آغاز ڈویژن ہیڈ کوارٹر مری سے کرنا تھا اور سیز فائر لائن کے ساتھ ساتھ ایک ہفتے تک اپنا سفر مکمل کرنا تھا۔ میں حسب معمول ایک دن پہلے ڈویژن ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔جی او سی میجر جنرل اختر حسین ملک نے مجھے فوراً پہچان لیا۔بڑے تپاک سے ملے اور اپنے ساتھ ٹی بریک میں لے گئے جہاں انہوں نے اپنے افسروں سے میرا تعارف کرایا اور میرے متعلق کئی ایسے تعریفی جملے کہہ ڈالے جن کا میں مستحق نہ تھا۔

چائے کے بعد ان کی آپریشنل بریفنگ تھی۔ جنرل صاحب نے فرمایا کہ'' آج آپ کوئی اور امپارٹنٹ کام نہیں کر رہے تو آیئے ہماری بریفنگ Attend کر لیجئے''میں نے حیرت سے مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ دعوت قبول کر لی۔ حیرت اس واقع پر کہ ایک نووارد کپتان کو اتنی خفیہ میٹنگ میں بلوا لیا اور مسرت اس بات کی کہ مجھ بھی رازہائے دروں کے اہل سمجھا گیا ہے۔ بریفنگ شروع ہوئی جو میں نے خاصی توجہ سے سنی آخر میں سوال و جواب شروع ہوئے تو ایک آفیسر نے کہا ''سر'سیز فائر لائن پر بھارتی فائرنگ کا منہ توڑ جواب تو ہم بھی دے سکتے ہیں مگر اقوام متحدہ کے مبصر ہیں جو خلاف ورزیوں کی گنتی رکھتے جاتے ہیں اور پھر جی ایچ کیو ہماری باز پرس کرتا ہے کہ ہم نے اتنی Violations Ceasefire کیوں کیں۔''

جنرل اختر حسین ملک کا جواب جرنیلی اینچ کا حامل تھا' انہوں نے فرمایا۔

''میں نے آپ کو یہ کام سونپ رکھا ہے کہ سیز فائر لائن کو ٹھنڈا نہ پڑنے دو۔ یہ بین الاقوامی سرحد نہیں۔ سیز فائر لائن ہے۔اسے ہر وقت Hot رکھو۔

جی ایچ کیو کو جواب دینا آپ کا نہیں' میرا کام ہے' میں اس سے نپٹ لوں گا۔''

جنرل اختر حسین ملک سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ میرا تاثر یہ تھا کہ یہ فوجی لیڈر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے یہ لکیر کا فقیر نہیں کچھ کر گزرنے کا ملکہ رکھتا ہے اسے آئندہ سالوں میں نظر میں رکھنا چاہیے کہ اس کی ابلتی ہوئی صلاحیتیں کس طرف اظہار پاتی ہیں۔

اگلی صبح امریکی ٹیم آ گئی' جنرل ملک نے خود اس کی بریفنگ کی ان کے سوالات کے جواب دیئے اور خاطر تواضع کے بعد انہیں مظفر آباد روانہ کر دیا کہ جاؤ' اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ہم نے آپ کے دورے کے سارے انتظامات مکمل کر دیئے ہے۔'' مہمان بھی ان کی فراخدلانہ سوچ اور رویے سے خاص مرعوب ہوئے۔

میں نے ان کے ساتھ سات دن تک سفر کیا' سڑکوں کی حالت آج بھی اچھی نہیں ان دنوں تو بالکل ابتر تھی' بہت دھکے کھائے' بہت سی خاک چھانی' لیکن جہاں بھی رات کا قیام کیا۔ فوج کے انتظامات کو آرام دہ پایا' نہانے کے لئے گرم پانی' سونے کے لئے نرم بستر عمدہ کھانا' عمدہ گفتگو' میزبان سراپا خدمت' مہمان سراپا تشکر!

چلتے چلتے ہم مظفر آباد اور کوٹلی کے درمیان ہجیرہ نامی ایک جگہ پر پہنچے تو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے باہر درختوں کی چھاؤں میں ایک کلاس لگی ہوئی تھی۔ پڑھنے والے سارے سویلین حضرات تھے اور ان کو پڑھانے والا ایک فوجی انسٹرکٹر تھا' سامنے سٹینڈ پر ایک بلیک بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر لکھا تھا Ambush یعنی شب خون مارنے کے طریقے ہمیں آتا دیکھ کر ہوشیار انسٹرکٹر نے فوراً چاک سے لکھا ہوا یہ لفظ مٹا دیا۔ مہمان گزرتے گزرتے وہاں رک گئے' ایک نے پوچھا کس چیز کا سبق دیا جا رہا ہے۔ این سی او نے جواب دیا ملیریا پر کاشن (Malaria Precaution) امریکی نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا'' معلوم ہوتا ہے اس علاقے میں مچھر بہت ہوتے ہیں'' مقامی بریگیڈیئر نے کہا'' جی ہاں مچھر بہت ہوتے ہیں۔'' دراصل امریکی مہمان نے بورڈ پر Anbush کے الفاظ پڑھ لئے تھے کیونکہ وہ پوری طرح مٹے نہیں تھے۔

اس قسم کے چھوٹے موٹے حادثات و واقعات سے گزرتے ہوئے ہم ساتویں دن آزاد کشمیر اور گجرات کے سرحد کے قریب بھمبر کے مقام پر جا نکلے۔ وہاں سے ہمیں جی ٹی روڈ سے ہوتے ہوئے براستہ کھاریاں راولپنڈی آنا تھا' میرا جی چاہا کہ میں گاؤں والوں کو اپنی کپتانی کی اک اور جھلک دکھا آؤں لیکن پچھلے تلخ تجربے کی بناء پر ارادہ ترک کر دیا سوچا کہ اب وہاں کوئی فوجی کیمپ نہ ہوا تو دلدل میں پھنسی ہوئی جیپ کون نکالے گا۔

میں رات کو کوئی آٹھ بجے راولپنڈی پہنچا تو لوگ ایڑھیاں اٹھا اٹھا کر میری راہ دیکھ رہے تھے۔ بیوی اس لئے پریشان تھی کہ وہ پہلی مرتبہ میرے بغیر شہر میں ایک ہفتے سے تنہا رہ رہی تھی اور میرے ڈائریکٹر اس لئے بیتاب تھے کہ انہوں نے اس شام مجھے ساتھ

لے کر چیف آف دی جنرل سٹاف کے پاس جانا تھا اور چیف آف دی جنرل اس لئے میرے منتظر تھے کہ وہ ٹیم کو اگلی صبح ملنے سے پہلے مجھ سے سفر کی روداد سننا چاہتے تھے۔

میں نے پہلے ڈائریکٹر صاحب کو اور پھر ان کی معیت میں سی جی ایس میجر جنرل شیر بہادر کو اپنے سفر کی روداد سنائی۔اس کے چیدہ چیدہ واقعات خاص کر ہیرہ والی کلاس کا ذکر کیا۔اور اپنے تاثرات سے انہیں آگاہ کیا۔جنرل صاحب نے پوچھا ''ان کے تاثرات تھے۔'' عرض کیا۔''وہ کہتے ہیں پاکستانی بڑے جھوٹے ہیں' لوگوں کو Ambush کا درس دیتے ہیں۔اور ہم سے ملیریا پر یکاشن کا بہانہ کرتے ہیں۔'''' اور کچھ'' جنرل صاحب نے مزید پوچھا' میں نے مزید عرض کیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم انڈیا سے ہو کر آئے ہیں' وہ بھی دروغ گوئی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں کیوں'' وہاں کیا ہوا۔'' پتہ نہیں' شاید وہاں بھی کوئی ہیرہ واقع ہوا ہو۔'' وہ خاموش ہو گئے اور اگلی صبح اس الزام تراشی کا جواب دینے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو گئے۔

اگلے ہفتے کمانڈر انچیف ملتان چھاؤنی میں یونٹوں کی انسپکشن کے لئے جا رہے تھے۔میں حسب روایت ایک دن پہلے وہاں پہنچ گیا۔اگلے روز چیف کی آمد سے پہلے میں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں جی ون کے پاس بیٹھا تھا (جی ون درحقیقت GSO-I یعنی جنرل سٹاف آفیسر گریڈ ا کا مخفف ہوتا ہے اور اس عہدے پر ایک لیفٹیننٹ کرنل فائز ہوتا ہے۔اس کا نائب جی ٹو GSO2 کہلاتا ہے) میرے بیٹھے میجر صاحب تشریف لائے اور بڑا اسمارٹ سلیوٹ کرنے کے بعد کرنل صاحب کو مطلع کیا کہ وہ ہیلی پیڈ (Heli Pad) سے ہو آئے ہیں۔سب انتظامات مکمل ہیں۔ایمبولینس کھڑی ہے۔فائر بریگیڈ (بوقت ضرورت خدمت انجام دینے کے لئے) موجود ہے۔سنتری ہیلی پیڈ کے گرد پہرہ دے رہے ہیں۔ملٹری پولیس بھی مستعد ہے۔''

کرنل صاحب نے فرمایا

''شاباش''

میجر صاحب نے شہ پا کر مزید فرمایا

''سر میں واپسی پر اس بنگلے سے بھی ہو آیا ہوں جہاں چیف قیام فرمائیں گے' وہاں بھی انتظامات ٹھیک ہیں۔ذرا بیت الخلاء میں کموڈ پرانا تھا' وہ میں نے بدلوا دیا ہے۔ٹھنڈے اور گرم پانی کا بندوبست موجود ہے کرنل صاحب نے جواب دیا۔'' شاباش' شہزادے اسی طرح تندہی سے کام کرتے رہے تو ترقی کرو گے' شاباش ویل ڈن'' شاباش لے کر میجر صاحب واپس چلے گئے اتنے میں ٹیلی فون کے لئے Seectopm Board کی میٹنگ ہوئی تھے اور لیفٹیننٹ کرنل صاحب بھی امیدواروں میں شامل تھے انہیں خاصی امید تھی

کہ وہ اگلے عہدے پر ترقی پا جائیں گے' لیکن جی ایچ کیو کی کال سن کر انہیں خاصی مایوسی ہوئی۔ ان کے چہرے کے تاثرات صاف بتا رہے تھے کہ امید بہر نہیں آئی۔

اتنے میں میجر شہزاد پھر بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے ''سر چیف کا ہیلی کاپٹر اگلے پانچ منٹ میں اترنے والا ہے۔'' کرنل صاحب نے بیدلی سے جواب دیا ''میاں کیوں ہلکان ہو رہے ہو۔ اس فوج میں کیا رکھا ہے۔ آؤ بیٹھو' چائے پیو' جنہیں چیف کو ریسیو کرنا ہے کر لیں گے۔''

میں اپنے فوٹو گرافر کو لے کر فوراً ہیلی پیڈ پر پہنچ گیا۔ چیف صاحب کا ہیلی کاپٹر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم سب منتظر کھڑے تھے۔ استقبال کرنے والوں میں جی او سی کے علاوہ کئی اور فوجی افسر بھی شامل تھے۔ پتہ نہیں کور آف سگنلز کے ایک کرنل صاحب کے سر میں کیا سمائی کہ انہوں نے ہتک آمیز انگلی کے اشارے سے ہمارے فوٹو گرافر کو بلوایا اور کہا ہماری تصویر بناؤ فوٹو گرافر چڑ گیا۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا ''آرڈر نہیں ہے'' ''تم کس کا آرڈر مانتے ہو'' کرنل صاحب نے اس ہتک آمیز طریقے سے مجھے بھی انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلوایا اور کہا ''یہ تمہارا فوٹو گرافر حکم عدولی کرتا ہے' کہتا ہے آرڈر نہیں ہے'' عرض کیا ''ٹھیک کہتا ہے۔'' کرنل صاحب مزید سیخ پا ہوئے اور غضب ناک لہجے میں کہنے لگے۔

''تو تم لوگ کس کا تصویر بناتے ہو۔''

عرض کیا۔

Those of Friends or Bosses. Please Try to Make the Grade Either Way

(دوستوں کی یا افسران بالا کی....... کسی ایک معیار تک پہنچنے کی کوشش کیجئے)

قبل اس کے کہ وہ اس گستاخی پر میری سرزنش کرتے' چیف کا ہیلی کاپٹر گرد و غبار اڑاتا ہوا اتر گیا' ہم نے سروں پر ہاتھ رکھ کر اپنی ٹوپیوں کو اڑنے سے بچایا' جلدی جلدی رومال سے منہ پونچھا اور آگے بڑھ کر کمانڈر انچیف کا استقبال کرنے لگے۔

ان دوروں کے بعد میں فوج میں خاصا رس بس گیا۔ مجھے فوج کی اچھائیوں اور خامیوں کا اندازہ ہونے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ ایسے دب کر بھی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں' اگر آپ حق بجانب ہیں تو فوج کا قانون آپ کا تحفظ کرے گا اور اگر آپ غلطی پر ہیں تو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔

◆◆◆

ادبی بریگیڈ

میں اچھا بھلا فوجی راستے پر چل رہا تھا کہ ایک دن ہمارے فوجی ہفت روزہ ھلال' کے فوجی مدیر میجر مسعود نے فرمایا۔''آپ ھلال کے لیے کیوں نہیں لکھتے'' عرض کیا''آپ کی اس خوش فہمی کی بنیاد کیا ہے''انہوں نے فرمایا کہ''آپ نے یوم شیر شاہ' عطائے پرچم اور دیگر فوجی تقریبات کی جو رپورٹیں لکھی ہیں' ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں خاصے موٹے موٹے ادبی جراثیم موجود ہیں'' میں نے کہا''جراثیم تو تھے لیکن میں نے فوج میں آنے سے پہلے ختم کر دیئے کیونکہ سنا تھا کہ فوج میں ادب چل سکتا ہے نہ بے ادبی' بس پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی بات ہے۔''انہوں نے فرمایا''قدم بے شک پھونک پھونک کر رکھو لیکن فوج میں ادب کا داخلہ ممنوع نہیں ہے' ابھی حال ہی میں آرمی ایجوکیشن کے ڈائریکٹر کرنل محمد خان نے دوسری جنگ عظیم کی یادداشتیں قسط وار ھلال میں رقم کی ہیں اور اب وہ انہیں کتابی شکل دینے میں مصروف ہیں۔''

چنانچہ میں نے میجر مسعود کے اشتعال پر ھلال' کے لئے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون لکھ ڈالا جس کا عنوان تھا''گھر کی بٹالین''اس میں ایک کثیر العیال کنبے کو ایک بٹالین میں بانٹا گیا تھا' لڑاکا قسم کی ساس کو کمانڈنگ آفیسر' بڑی باجی کو سیکنڈ ان کمانڈ' گھر بار کی انچارج بہو کو کوارٹر ماسٹر اور چالاک و ہوشیار چھوٹی آپا کو ایڈ جوٹنٹ کے عہدے سونپے گئے تھے۔ یہ ایک دیہاتی کنبہ تھا جس کے پڑوس میں ان کے شریک' اور رقیب' رہتے ہیں' ایک دن ان کے درمیان ایک معرکہ جنگ برپا ہوا تو بڑی باجی نے وہ سنائیں وہ سنائیں کہ دشمن کی (زبانی) توپیں ختم ہونے پر مجبور ہو گئیں' تھوڑی دیر کے بعد چھوٹے ہتھیاروں کا فائر کھلا تو چھوٹی آپا نے ایسی بے نقط سنائیں کہ دشمن کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا' پھر بھاری توپ کے طور پر ساس کو لانچ کیا گیا تو انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور چند گھنٹوں کے معرکے کے بعد انہوں نے میدان مار لیا۔

اس مضمون کا بعض لوگوں نے نوٹس لیا' ایڈیٹر نے بھی حوصلہ افزائی فرمائی اور مزید لکھنے پر اصرار کیا' میں نے فوجی افسر اور اس کی بیوی کا الگ الگ آرزو نامہ لکھ ڈالا جس میں کچھ اس قسم کے جملے بھی شامل تھے۔

فوجی آفسر کا آرزو نامہ

(ا)(میری بیوی) دوسروں کے سامنے میری سرپرستی نہ فرمایا کریں مجھے خواہ مخواہ اپنے حقوق پر شک ہونے لگتا ہے۔

(ب) جب گھر میں میرے اور میری بیوی کے آرڈر مختلف ہوں' تو بچے میرے آرڈر کو ترجیح دیا کریں۔

(ج) وہ مجھ سے ایسے کام کروانے کے وعدے اپنی سہیلیوں سے نہ کیا کریں جو میرے اختیار سے باہر ہوں۔

(د) وہ مہمانوں کو مسکراہٹوں کے جس خزینے سے خوش آمدید کہتی ہیں' اس کا کچھ حصہ مجھ پر بھی خرچ کیا کریں.......وغیرہ

فوجی افسر کی بیوی کا آرزونامہ

(ا) ان کی فوجی مشقیں گرمیوں میں نہ ہوا کریں کیونکہ ان کا رنگ سانولا ہو جاتا ہے۔

(ب) جب میں انہیں دفتر ٹیلی فون کروں تو وہ اٹھاتے ہی ''یس سر'' نہ کیا کریں۔

(ج) وہ شام کو میرے ساتھ چہل قدمی کے دوران قدم ملا کر نہ چلا کریں۔

(د) وہ مجھ سے اس انداز سے گفتگو نہ کیا کریں' جس انداز میں وہ یونٹ میں کاشن دیتے ہیں۔

(ر) کاش وہ غیر فوجیوں کی محفل میں فوجی باتیں کم کیا کریں وغیرہ میری اس تحریر کا نوٹس پہلی تحریر سے بھی زیادہ لیا گیا' کئی سینئر افسروں نے ڈائریکٹر صاحب کو شکایت کے فون کئے اور بعض اعلیٰ افسروں نے اس گستاخی پر مجھے براہ راست جھاڑ پلائی البتہ ایڈیٹر کو عام قارئین کی طرف سے کچھ تعریفی خط بھی موصول ہوئے لیکن حسب روایت تعریف فائل میں دب کر رہ گئی تنقید طشت از بام ہوئی۔ مجھے اپنی ادبی کاوشوں کو لگام دینا پڑی۔

یہ کاغذی گھوڑے دوڑانے کا البتہ ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ کرنل محمد خان نے مجھے ٹیلی فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی' یہ جونیئر کیپٹن صدیق سالک کے نام ایک سینئر کرنل کا پہلا ٹیلی فون تھا۔ میں گھبراہٹ میں تقریباً کھڑا ہو گیا اور سکھلائی کے مطابق سر' سر' کہنے لگا کیوں کہ مجھے ایک خیر خواہ نے بتایا تھا کہ جس طرح پٹھان کو خوش کرنے کے لئے کم از کم ایک مرتبہ خان کہنا ضروری ہوتا ہے اور اگر پھر بھی خوش نہ ہو تو اس کے نام کے آگے اور پیچھے ''خان'' لگانا پڑتا ہے' مثلاً خان عبدالوحید خان' اس طرح فوج میں بھی سینئر افسر سے گفتگو کرتے وقت ہر جملے کے شروع میں سر' کہنا دافع بلا ہوتا ہے اور اگر پھر بھی بلا نہ ٹلے تو جملے کے آخر میں بھی سر لگا دینا اکسیر ہے مثلاً ''سر میں آپ کی بات سمجھ گیا سر!'' چنانچہ میں نے سر سر کی گردان میں کرنل محمد خان سے گفتگو کی اور ان کی خواہش کے فوری احترام میں فوراً سائیکل پر سوار ہو کر ان کے دفتر میں پہنچ گیا۔

میں اپنی استعداد کے مطابق سیلوٹ کر کے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا' انہوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا' ٹوپی اتارنے کی اجازت

مرحمت فرمائی' اپنے سپرنٹنڈنٹ زبیری صاحب کو خصوصی چائے کا آرڈر دے کر مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ اس وقت تک ان کی لافانی تصنیف ''بجنگ آمد'' نہیں چھپی تھی' عرف عام میں وہ بطور مصنف ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے' تاحال ان کی شناخت کے موٹے موٹے اسباب چکوال (بلکسر) سے ان کا جغرافیائی تعلق اور آرمی ایجوکیشن میں فل کرنل کا رینک اور بعض معلاملات میں ان کا ذوق سلیم تھا۔ مجھے وہ خاص شفقت سے ملے' ان میں کرنیل کم بولا اور ادیب زیادہ' انہوں نے مجھ سے دور حاضر اور دور قدیم کے مزاح نگاروں کے متعلق بات چیت کی اور میں نے عظیم بیگ چغتائی سے لے کر پطرس بخاری تک اور اودھ پنچ' سے لے کر نمکدان' تک ہر شے پر بے تحاشا اور بے محابا تبصرہ کر ڈالا' اس وقت تو انہوں نے چائے کی دوسری پیالی پیش کرنے کے علاوہ کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا مگر بعد میں انہوں نے بتایا کہ وہ یہ دیکھ کر خاصے مرعوب ہوئے تھے کہ کل کا کپتان کس اعتماد سے کتنے جغادری لکھنے والوں پر رائے زنی کرتا ہے۔ مجھے اس کا انعام یہ ملا کہ کرنل نے مجھے اپنے عقیدت مندوں میں شامل کر لیا۔

پھر ان کی وساطت سے اور کبھی براہ راست دوسرے فوجی ادیبوں سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا' جن میں میجر ضمیر جعفری' لیفٹیننٹ کرنل شفیق الرحمٰن اور بریگیڈیر گلزار احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں' بریگیڈیر گلزار تو میرے فوج میں آنے سے پہلے ہی سیف و قلم کی جولانیاں دکھا کر ریٹائر ہو چکے تھے' ضمیر جعفری ساری عمر کپتان رہنے کے بعد ڈیپوٹیشن پر کیپٹل ڈیویلپمنٹ اتھارٹی میں چلے گئے تھے اور وہیں تیرہ سال کی مدت پوری کرنے پر بالآخر میجر کے عہدے تک پہنچ گئے تھے۔ شفیق الرحمٰن اگرچہ آرمی میڈیکل کور میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز تھے اور جلد ہی فل کرنل بھی ہو گئے لیکن میرے ذہن میں ہنوز کیپٹن شفیق الرحمٰن تھے' کھلنڈرے' رومان پسند' ارمان پرور خوش وضع وخوش پوش جو حسیناؤں کے پیچھے خود کم بھاگتے اور حسینائیں ان کا پیچھا زیادہ کرتے تھیں۔

یہ سب حضرات ایک ہی فوجی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اندر سے خربوزے کی طرف الگ رنگ اور ذائقہ رکھتے تھے مثلاً شفیق الرحمٰن بولتے کم اور مسکراتے زیادہ تھے' کوئی بھی نکتہ اٹھائیے فوراً اتفاق کر لیتے تھے۔ ان کے برعکس بریگیڈیر گلزار احمد بحث مباحثہ کرنے اور مجمع لگانے کے ماہر تھے۔ ان کی دلچسپ گفتگو اور بحث سن کر ان کی کتابیں پڑھنے کو جی چاہا جو انہوں نے بڑی شفقت سے پیش کیں لیکن انہیں جوں جوں پڑھتا گیا' دلچسپ مکالمہ باز اور بذلہ سنج گلزار پس منظر میں چلا گیا اور ایک عالم فاضل مقالہ نگار میری آنکھوں کے سامنے ابھرتا گیا۔ میں نے ان کی کتابیں پڑھنا کم کر دیں اور ان سے ملنا زیادہ شروع کر دیا۔

ضمیر جعفری سید بادشاہ ہیں' ہر کوئی ان کے دروازے سے فیض پاتا ہے' مجھے وہ خاصی دیر سے ملے' ان سے فیض پانے والوں میں

اب مردہی رہ گئے تھے۔ مجھ سے ان کا رویہ فیاضانہ تھا' میں ان کے پاس ایک مرتبہ جاتا' وہ دوبار میرے پاس چلے آتے۔ اگرچہ اب میرے دودھ کے دانت نہ تھے لیکن وہ مصنوعی دانت لگوانے کی منزل تک پہنچ چکے تھے۔

کرنل محمد خان اندر سے الجھے ہوئے اور باہر سے سلجھے ہوئے سینئر افسر تھے' ہر شے میں بڑا نفیس ذوق پایا تھا' بہت کم خواتین و حضرات ان کے معیار دوستی پر پورے اترتے تھے خواتین کے بارے میں تو یہ پھر بھی ذرا نرمی برت لیتے تھے لیکن مردوں سے دوستی لگانے میں اپنے معیار میں ہرگز کمی نہ کرتے تھے' لیکن مجھ پر انہوں نے خاص عنایت کی اور مجھے اپنے حلقہ ارادت میں جگہ دے دی۔

یہ چاروں احباب مجھ سے عمر میں کئی گنا بڑے اور عہدے میں سینئر تھے لیکن انہوں نے کبھی بھی مجھے اپنی علمی کم مائیگی یا طبعی ناپختگی کا احساس نہ دلایا' میں ان کی محفل میں بیٹھ بیٹھ کر قبل از وقت بوڑھا ہو گیا اور میری تحریروں میں سنجیدگی غالب آنے لگی۔

ان سب میں سے کرنل محمد خان کا دفتر میرے قریب تھا' اس لئے اکثر یا وہ بلا لیتے یا میں چلا جاتا۔ میرے پہنچتے ہی زبیری صاحب سگھڑ خاتون خانہ کی طرح' خاص آنچ میں دم کی ہوئی چائے کی کیتلی دو صاف ستھری پیالیوں سمیت ہمارے پاس بھجوا دیتے' خود ٹیلی فون سنبھالتے اور ہمیں کسی خلل کے بغیر گفتگو کا موقع دیتے۔ ایک دن کرنل صاحب فوج کے متعلق میرے تاثرات پوچھ بیٹھے' میں نے عرض کیا کہ مجھے فوج میں آنے کا کوئی پچھتاوا نہیں' اس ادارے میں بڑی خوبیاں ہیں' غالباً ہمارے معاشرے کا یہ واحد ادارہ ہے جو اب بھی صاف ستھرا' صحت مند اور صحت بخش ہے۔ اور مجھے وردی پہن کر پہلی دفعہ معاشرے میں اپنی اہمیت کا احساس ہوا ہے۔ میں نے ایبٹ آباد کے بھرے بازار میں پولیس کانسٹیبل اور ٹریفک سارجنٹ کے سلیوٹوں کو ذکر کیا اور کہا اگر ایک ادنیٰ کیپٹن کا اتنا رعب ہے' تو بطور فل کرنل ان سے تو سویلین لوگ کانپتے ہوں گے۔ انہوں نے جواباً یہ واقعہ سنایا۔

''حال ہی میں جی ایچ کیو میں اعلیٰ افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس کی صدارت فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ نے کی' پیشہ ورانہ امور پر بات ختم ہوئی تو فوجی افسروں کی ویلفئر کا ذکر چھڑا' ایک صاحب نے کہا کہ جی ایچ کیو صبح ساڑھے سات بجے لگتا ہے اور دو بجے بند ہوتا ہے جب کہ مقامی سکول خاص کر انگلش میڈیم سکول آدھ گھنٹہ پہلے کھلتے اور آدھ گھنٹہ پہلے بند ہوتے ہیں' اگر وہ اپنے اوقات جی ایچ کیو کے اوقات کے ساتھ Adjust کرلیں تو بچوں کو سکول میں چھوڑنے اور لینے میں سہولت رہے گی' کمانڈر انچیف نے فوراً ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کو طلب کیا اور حکم دیا کہ ان سکول والوں سے کہو کہ اپنا ٹائم ٹھیک کریں' کرنل صاحب کا کہنا ہے کہ وہ کمانڈر انچیف کے حکم سے مسلح ہو کر اپنی چھڑی گھماتے سارے انگلش سکولوں میں گئے' انہیں افسروں کی دقت سمجھائی' ذاتی اثر و رسوخ استعمال کیا اور کمانڈر انچیف کا حکم سنایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر جی ایچ کیو نے اپنے وقت سکولوں کے اوقات کے مطابق

Adjust کر لئے“

یہ واقعہ سن کر مجھے اپنی اوقات معلوم ہوگئی اور میں مزید اونچا اڑنے کی بجائے زمین پر آ گیا۔

کرنل محمد خان کے دفتر میں ہی ایک اور نوجوان اور خوبرو کیپٹن سے ملاقات ہوئی‘ جن کا نام انور خاں انور تھا (وہ فل کرنل کے عہدے پر پہنچے مگر ہارٹ اٹیک کی وجہ سے اچانک وفات پا گئے) کرنل محمد خان سے ان کا دہرا رشتہ تھا ایک تو وہ ایجوکیشن کور سے تعلق رکھتے تھے دوسرے وہ بھی چکوال کے رہنے والے تھے انہیں رہائشی مکان کا مسئلہ درپیش تھا اور وہ کرنل صاحب سے مدد چاہتے تھے۔ کرنل صاحب نے فرمایا۔

”برخوردار انور! اچھ جانو‘ میں نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں افسران متعلقہ تک تمہاری کتھا پہنچائی ہے لیکن کیا زمانہ آ گیا ہے لوگ اتنے سنگدل ہو گئے ہیں کہ کسی کا دل نہیں پسیجا‘ کسی کے منہ سے ہمدردی کے چند بول نہیں نکلے‘ بڑا کھرا سا سرکاری جواب دے کر خاموش ہو گئے کہ اس کا نام ویٹنگ لسٹ پر ہے‘ باری آنے پر اس کے مسئلے پر غور کیا جائے گا۔ اب بتاؤ یار کیا کروں۔“

اس سے مجھ پر مزید واضح ہو گیا کہ فل کرنل ہونے سے کچھ نہیں ہوتا‘ نہ جی ایچ کیو کے اندر نہ جی ایچ کیو سے باہر!

کیپٹن انور یہ جواب سن کر بالکل دل برداشتہ نہ ہوا بلکہ اپنی روایتی خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ خود ایک ہنس مکھ‘ زندہ دل اور مزاح گو نوجوان تھا۔ کرنل محمد خان نے اپنے سامنے دو کیپٹن دیکھ کر پوچھا کہ تم میں سے ایک ایجوکیشن کور میں ہے اور دوسرا پی آر میں‘ آپ نے کبھی سوچا کہ آپ نے اپنے اپنے شعبے میں کیا تیر مارا۔ میں نے عرض کیا۔ میری فتوحات تو آئی ایس پی آر میں پابندی وقت نافذ کرنے میں ناکامی سے لے کر چند فوجی تقریبات کی رپورٹنگ تک محدود ہیں‘ البتہ انور کی نوکری زیادہ ہے‘ اس سے پوچھ لیں ممکن ہے اس نے اپنی سولہ جماعتوں کا کوئی مفید استعمال کیا ہو۔

کرنل محمد خان نے روئے سخن انور کی طرف کیا تو اس نے کہا۔ ”سر! اگر اجازت دیں تو میں سالک صاحب کو پچھلے سال والا واقعہ سناؤں جو جی ایچ کیو میں پیش آیا تھا۔“ کرنل صاحب سے اجازت پا کر اس نے کہا۔

”سالک صاحب! ہم ایجوکیشن کور والے وقتاً فوقتاً فرنٹیئر کور (ملیشیا پوش نیم عسکری دستے) میں بھی دو تین سال کے لئے بطور ایجوکیشن آفیسر چلے جاتے ہیں کیونکہ وہاں کام تھوڑا اور الاؤنس زیادہ ہوتا ہے۔ دو تین سال لگانے کے بعد آدمی سکوٹر خریدنے یا بچے کو کیڈٹ کالج میں داخل کرانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ میں بھی دو سال ایف سی میں ایجوکیشن آفیسر رہا ہوں‘ یہاں ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ میں پوسٹنگ سے پہلے وہیں تھا۔ پچھلے سال فرنٹیئر کور میں آخری سال تھا‘ ڈائریکٹر جنرل ملٹری ٹریننگ (میجر جنرل

شریف) نے جی ایچ کیو میں ایجوکیشن افسروں کی ایک کانفرنس بلائی' وہ سب افسروں کو سامنے بٹھا کر آکسفورڈ ین لہجے میں باری باری ہر ایک سے پوچھتے ''تم نے اپنے فارمیشن میں ایڈوکیشن سٹینڈرڈ ہائی کرنے کے لئے کیا کیا'' ہر کوئی اپنی صوابدید اور اہلیت کے مطابق جواب دیتا رہا۔ جب میری باری آئی تو جنرل صاحب نے خالص انگریزوں کی طرح منہ کو بل دے کر کہا۔ ''انور تم نے ایڈوکیشن کے فیلڈ میں کیاImprovement کیا۔'' میں نے چکوالی اردو میں جواب دیا۔ ''سر' میری دو سالہ کوششوں کے سبب فرنٹیئر کور کے سپاہی یہ جان گئے ہیں کہ اردو کے حروف ابجد میں دوسرا حرف ب' ہے اور اس پر نقطہ اوپر کی طرف نہیں' نیچے کی طرف لگتا ہے' جنرل صاحب نے کہا'' گڈ' گڈ....... Good Improvement!''

جلد ہی ہماری یہ دفتری ملاقاتیں گھروں تک بھی پھیل گئیں' مجھے انور کی طرح فوجی وضع قطع کا بنگلہ تو نہ مل سکا لیکن فیروزسنز کے سامنے مال روڈ پر واقع مال ہوٹل میں چند کمروں پر مشتمل ایک سیٹ الاٹ ہو گیا۔ میں نے اپنی چند کرسیاں' چند چارپائیاں' ایک صوفہ سیٹ' دو دریاں اور جہیز کا صندوق اس سیٹ میں سجا لیا۔ جو دری بہتر تھی وہ مہمانوں کی تواضع کے لئے ڈرائنگ روم میں بچھادی اور پھٹی ہوئی چوہے زدہ دری اپنے بیڈروم میں۔ مہمان آنے جانے لگے' ان میں سویلین ادیب و شعراء بھی شامل تھے اور اصحاب سیف و قلم بھی۔ دراصل میں نے اصحاب سیف و قلم محاورتاً لکھ دیا ہے کیونکہ کرنل محمد خان' لیفٹیننٹ کرنل شفیق الرحمٰن ڈاکٹر تھے جو اپریشن کے لئے نشتر بھی نہیں چلاتے تھے بس مرہم پٹی کرتے تھے یا دوائیاں دیتے تھے' باقی دونوں حضرات شعبہ تعلیم سے متعلق تھے جہاں وہ ان پڑھ فوجیوں کو ب کا نقطہ اوپر نہیں نیچے لگانے کی تلقین کرتے تھے اور میں پبلک ریلیشنز میں ہونے کی وجہ سے ویسے بھی لڑائی و بھڑائی کو تعلقات عامہ کے لیے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ بہرحال ان نیم فوجی اور سویلین اہل قلم حضرات کی محفل خوب سجتی تھی' میری طرف سے ایک پیالی چائے اور خستہ پکوڑے بکثرت مل جاتے تھے اور کبھی کبھی دال روٹی بھی کھانے کو مل جاتی تھی۔ اسی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے سید ضمیر جعفری نے روایتی شاعرانہ مبالغے سے کام لیتے ہوئے یہ شعر کہا تھا۔

واہ اے سالک ترے مہمان بھی
کھا گئے روٹی بھی دسترخوان بھی

سید ضمیر جعفری کو یوں تو کئی چیزوں کی لت ہو گی لیکن ان دونوں ان کا زور چاٹ پر تھا' سربازار ٹھیلے پر کھڑے ہو کر چاٹ کھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے ساتھ عموماً مشہور مزاحیہ شاعر نذیر احمد شیخ (حرف بشاش کے مصنف) ہوا کرتے تھے' کئی مرتبہ میں نے انہیں اپنے مکان کی کھڑکی سے فیروزسنز کی بک شاپ کے سامنے یہ عیاشی کرتے دیکھا۔ عموماً وہ کھا پی کر ہمارے گھر آ جاتے اور صرف

چائے کی ایک پیالی کا تقاضا کرتے اور ٹھنڈی میٹھی چائے شڑک شڑک کر چلے جاتے۔

ان ہی ادبی محفلوں کے دوران مجھے اردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ماجد صدیقی سے شرف ملاقات حاصل ہوا جو جلد ہی دوستی اور احترام میں بدل گیا' ان دنوں وہ غالباً تلہ گنگ میں پڑھاتے تھے اور جزوقتی شاعری فرماتے تھے' ان کی ہمہ وقتی استادی کا اندازہ آپ خود کر لیجئے' مجھے تو ان کی جزوقتی شاعری کا پھل دیکھنے کا موقع ملا ہے' وہ خود ہی اپنی کتابیں لکھتے' چھاپتے اور فروخت کرتے ہیں۔ ایک سہ پہر کو وہ دو بوریاں تانگے میں لاد کر میرے دروازے پر آئے اور کہنے لگے" ایک بوری میں غزل کی کتابیں ہیں اور دوسری میں نظم کی۔ ابھی ابھی پریس سے لایا ہوں۔ تم اسے اپنے ڈرائنگ روم میں سنبھال کر رکھ لو' میں تلہ گنگ میں ذرا نوکری کر آؤں" اگلے پھیرے میں اپنا مال لے جاؤں گا۔" اب تو گزشتہ بیس پچیس برسوں میں وہ کئی بوریاں شعر تخلیق فرما چکے ہوں گے جبکہ میری ساری کمائی تو ایک بوری بھی نہیں بنتی۔

ان ہی محفلوں کے دوران ایک مرتبہ سید ضمیر جعفری نے ہمارے ادبی بریگیڈ یعنی (درجہ بدرجہ) کیپٹن صدیق سالک' میجر ضمیر جعفری' لیفٹیننٹ کرنل شفیق الرحمٰن' کرنل محمد خان اور بریگیڈیر گلزار احمد کی تحریروں کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ مزاح لکھنے کی بھی ایک عمر اور ایک عہدہ ہوتا ہے۔ اچھا دور تو کپتانی کا ہے' جیسے کپتان شفیق الرحمٰن نے لکھا' پھر میجر تک بھی ٹھیک ہے جیسے میجر جعفری' ذرا اور کھینچا جائے تو مزاح کرنیلی تک بھی ساتھ دے سکتا ہے جیسے کرنل محمد خان' لیکن اس کے بعد بھی اگر انسان اسے ترک نہ کرے اور مزاح لکھنے پر اصرار کرے تو وہ بریگیڈیر گلزار بن کر رہ جاتا ہے۔ مخلص اور سادہ لوح بریگیڈیر گلزار اس خراج پر بہت خوش ہوئے۔

◆◆◆

جب رن آف کچھ میں رن پڑا

بڑے آرام سے فوجی اور ادبی سرگرمیوں سے میری زندگی دو آتشہ ہو رہی تھی کہ ہندوستان نے رن کچھ میں جنگ کی آگ سلگا دی۔فوج میں اس وقت میری عمر بمشکل چھ ماہ تھی چھ ماہ کا افسر ہو یا بچہ اپنے اپنے معاملات میں بڑا معصوم ہوتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی معصومیت کے پردے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ سب سے پہلے تو پاکستان کا نقشہ کھول کر دیکھا کہ سندھ بارڈر کے کس بل پر واقع ہے اور پھر یہ جاننے کی کوشش کی کہ پیاسی ریت کے اس قطعہ صحرا کو خون سے سینچنے کی کیا ضرورت تھی۔

نقشے پر بدین کے جنوب میں ۲۳ ء ۵۸ عرض بلد پر سرحدی لائن میں ایک چھوٹا سا بل نظر آیا جو بچھو کی طرح دم کی کنڈلی بنا کر بیٹھا تھا۔زمین کی نوعیت دیکھی تو ریت کے سوا کچھ نظر نہ آیا' تنازعے کے پس منظر کے متعلق پتہ چلا کہ آزادی سے پہلے یا بعد میں حد بندی نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان سمجھتا تھا یہ علاقہ اس کا ہے اور ہندوستان کا دعویٰ تھا کہ یہ اس کی ملکیت ہے۔اس موضوع پر کئی کانفرنسیں بھی ہوئی تھیں جن میں سے آخری کانفرنس ۱۹۶۰ء میں لیفٹیننٹ جنرل کے۔ایم۔شیخ اور سردار سورن سنگھ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان نے مہلت مانگی تھی تاکہ وہ اپنے دعوے کی تائید میں مزید دستاویزی شہادتیں جمع کر سکے۔ پاکستان نے اس کی بات مان لی۔اس موقع پر دونوں ممالک نے طے کیا کہ وہ اس مسئلے کے تصفیے تک موجودہ صورت حال کو بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ پاکستان نہ صرف اپنے وعدے پر قائم رہا بلکہ مطمئن بھی ہو گیا کہ چلو جھگڑے کے امکانات کم ہو گئے۔

جس طرح ہندوستان نے ۱۹ سال بعد ۱۹۸۴ء کے اوائل میں چپکے سے سیاچین گلیشئر کے متنازعہ علاقے پر قبضہ کر لیا۔اسی طرح اپریل ۱۹۶۵ء میں بھارتی فوجیں چپکے سے بیار بیٹ کے علاقے میں گھس آئیں۔۲۶ اپریل کو پاکستان آرمی کے مقامی دستے نے انہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کی تو وہ مورچہ بند ہو کر ڈٹ گئے اور گولیاں اور گولے برسانے لگے۔یہی تو انداز ہوتے ہیں جھگڑے کو بڑھانے کے چنانچہ بات بڑھ گئی۔ پاکستان نے اس علاقے میں تعینات بریگیڈ کو جس کی کمان میں میرے ضلع (گجرات) کے ایک بہادر سپوت بریگیڈئر افتخار جنجوعہ کر رہے تھے دشمن کو وہاں سے نکال پھینکنے کا مشن دیا' بریگیڈئر جنجوعہ نے جوابی حملے کا پلان بنایا اور پوری پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا' حملہ اتنا زوردار اور ایمان افروز تھا کہ دشمن اس کے آگے نہ ٹھہر سکا' وہاں پر متعین بھارت کے ۵۰ پیرا بریگیڈ کے افسر اور سپاہی اپنی جانیں بچا کر بھاگ گئے' کچھ کام بھی آئے' بعض تو جلدی میں اپنے پاجامے اور

جوتے بھی چھوڑ گئے۔ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ عقبی موروچوں میں غالباً گرمی کی وجہ سے انہوں نے کپڑے اتار رکھے تھے۔ بہر حال جب انہیں اپنی جان بچانے اور پاجامے سنبھالنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو انہوں نے زیادہ قیمتی چیز کا انتخاب کیا حالانکہ کہتے ہیں بنیا بڑا مادہ پرست ہوتا ہے۔

سچ پوچھئے تو یہ سب کچھ مجھ سے بالا بالا ہی ہو گیا' جنگ چھیڑنے' لڑنے یا جیتنے میں میرا کوئی ہاتھ نہ تھا' البتہ فتح کی خبر سن کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کیونکہ فتح کے دعویدار تو سبھی بن جاتے ہیں شکست کا والی وارث کوئی نہیں ہوتا۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ چھوٹا سا معرکہ درحقیقت ایک بڑی جنگ کی تمہید تھا جو چند ماہ بعد لڑی جانیوالی تھی اور جس کے متعلق بھارت وزیراعظم نے دھمکی دی تھی کہ اب ہم اپنی پسند کے محاذ پر لڑیں گے۔

اپریل ۱۹۶۵ء کے معرکے میں ہمارے ادبی بڑگیڈ کا حصہ صرف اتنا تھا کہ ہمارے ایک معزز اور معمر رکن (معمر پر وہ ضرور ناراض ہوں گے) میجر سید ضمیر جعفری نے ایک ولولہ انگیز ترانہ لکھ دیا' اس کا عنوان تھا ''ران کارن''

ران کارن

نیفے میں سر منڈا کے جو پہنچے بیار بیٹ
ثابت ہوا کہ پسر برہمن ہے سخت ڈھیٹ
آنے لگا کے آہن و بکتر کی ریل پیل
بیٹھے جما کے خیمہ و خندق میں اپنی سیٹ
اکڑی ہوئی تھی شوخ ڈیل وردیوں کی زین
پچکی ہوئی تھی دل میں مگر حوصلوں کی چھیٹ
بر میں ''سویٹ ہارٹ'' کی تصویر تر بہ تر
تھیلے میں ہر دوار کی تازہ ''سویٹ میٹ''
بنکر میں عطر و سرخی و غازہ کی بوتلیں
لالہ کے ساتھ ساتھ تھی لالہ کی مارکیٹ
سمجھے ہوئے تھے جنگ کو وہ بمبئی کی شام

پاپڑ تھے اورماش کی وسکی تھی اور نیٹ
وردی کی آب وتاب تو ''مروی'' کے ساتھ ہے
چڑیوں کے بازوؤں میں کہاں باز کی جھپیٹ
ہمت اگر نہ ہو تو بڑی توپ ایک بوجھ
جذبہ اگر نہ ہو تو نیا ٹینک ''آبس لیٹ''
بنئے کی دال ابل کے سر دشت آگئی
موجود تھا وہاں بھی مسلماں کا گرم میٹ
جب بڑھ کے ایک وار کیا افتخار نے
اور غازیان پاک نے کی دھم سے مارپیٹ
دھوتی جو ران پر تھی وہ رن میں پڑی رہی
اتنا بڑا فلاپ تھا' جتنا بڑا فلیٹ
اوسان یوں خطا کر پکوڑا نہ چکھ سکے
بھگدڑ کچھ اس طرح کہ اولمپک میں کوئی ہیٹ
بھارت کے سور بیروں کی درگت کا سلسلہ
نیفے سے جو چلا تھا ہوا کچھ میں کمپلیٹ
چھ فٹ کے ''نادروں'' سے نہ الجھو نہال چند!
وہ شیر ابن شیر ہے' تو چاٹ اور چیٹ
واقف ہیں غازیوں کی دھمک سے ترے بزرگ
بازو ہیں تیغ تیز تو سینہ ہے کنکریٹ

◆◆◆

جنگ ستمبر۔ا

ہندوستان کے ساتھ میرے ذاتی تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں ہو سکتے کیونکہ اس نے میری کپتانی کی پہلی سالگرہ پر میرے وطن عزیز پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ اس کی یہ حرکت معروضی لحاظ سے بھی کوئی ایسی لائق ستائش نہ تھی لیکن اس کی جارحیت سے میرے ذاتی پروگرام میں جو خلل پڑا اس کے لئے میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔

جنگ کی آگ بھڑکنے سے پہلے کچھ کچھ دھواں اٹھ رہا تھا جو مجھ جیسے جونیئر لوگوں کو بھی دکھائی دے رہا تھا ایک تو اپریل مئی ۱۹۶۵ء میں بھارتی وزیراعظم نے واشگاف الفاظ میں اپنی مرضی کے محاذ پر جنگ کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ پھر اس نے اس دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فوجیں اور اسلحہ بھی جمع کرنا شروع کر دیا تھا اس کے علاوہ مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین نے تھرتھلی مچا رکھی تھی اور عام تاثر یہ تھا کہ کشمیر سے اٹھنے والی بھاپ آخر کار بین الاقوامی سرحد پر شعلوں کی شکل اختیار کر لے گی۔ لیکن بڑوں کا خیال تھا کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ بڑوں کے بڑے نے اس عمل کی یقین دہانی کرا رکھی تھی۔

اگست ۶۵ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ ڈائریکٹر صاحب نے رازداری کے عالم میں مجھے بتایا کہ آج سے تمہیں ایک نہایت خفیہ اور حساس کام سونپا جا رہا ہے۔ کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ ورنہ تمہاری کپتانی کے ساتھ میری ڈائریکٹری بھی جائے گی۔ میں ان کے خوف سے پہلے ہی کانپ رہا تھا۔ خفیہ اور حساس کام کی نوید سن کر مزید کانپنے لگا۔ انہوں نے تسلی دی اور فرمایا ''نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں، تم کاغذ پنسل لے کر جی ایچ کیو کے فلاں شعبے میں چلے جاؤ۔ وہاں ایک لیفٹیننٹ کرنل رشید ہوں گے۔ وہ تمہیں اندرون کشمیر مجاہدین کی کارروائی کے سگنل (تار دکھائیں گے۔ تمہارا کام ان تاروں کو پڑھ کر ایک پریس ریلیز بنانا ہے۔ جو ان کے زیر اہتمام ریڈیو صدائے کشمیر مظفر آباد سے نشر ہوگا۔ انہوں نے مزید تاکید کی کہ ان تاروں سے لئے گئے نوٹس اور ڈرافٹ پریس ریلیز وہیں تلف کر آنا اور ذہن میں بھی کوئی بات نہ رکھنا جس طرح کورے ذہن سے جا رہے ہو اسی طرح خالی الذہن واپس آنا۔ یہ تمہاری روز کی ڈیوٹی ہے ذرا احتیاط سے انجام دینا۔''

میں کاغذ پنسل اور ڈائریکٹر صاحب کے حکم سے لیس ہو کر اپنی پہلی جنگی مہم پر روانہ ہو گیا۔

جی ایچ کیو والوں کے حضور حاضری دی تو انہوں نے کام تو وہی بتایا البتہ پریس ریلیز کو War Communique کا نام

دیا جس سے مجھ پر خاصا رعب پڑا۔ میں سگنلز (تار) لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور ایک ایک تار کو بغور پڑھنے لگا لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑ رہا تھا کیونکہ جو انگریزی میں زندگی بھر پڑھتا اور پڑھاتا رہا تھا اس کا دور دور کوئی نشان نہ تھا۔ مثلاً

sitrep 5(.) pd 280600aug to 281900aug(.) ONE(.) en(.) loc and

ident no change(.) peridodic en shelling BDE area continue(.)

no hostile ptl activity(.) TWO(.) own sit(.) no change(.)

THREE(.) adm(.) ten pers cas(.) two veh cas(.) rat pt not

estb new loc(.) all info

unit demand ord stores(.) boots DMS qty 87 cmm helves all

sorts qty 352 cmm house wife qty 51 cmm net cam 106 RR

qty 5 not issued so far(.) request expedite issue.

air sup request(.) V(.) 3 DIV/12(.) W(.) 300700 apr(.) X(.)

DZ PQ 416215 red smk landmk br 4421 NE 1500 M of DZ(.) Y(.) 105

MM HOW HE 300 rds(.) Z(.) avoid en AA area 4320

میں ان جملوں پر سر دھنتا رہا۔ وقفے وقفے سے سر کھجاتا بھی رہا۔ لیکن سر دھننے سے فرق پڑا نہ سر کھجانے سے چپکے سے اٹھ کر آکسفورڈ ڈکشنری اٹھائی وہ بھی مددگار ثابت نہ ہوئی' کوئی آدھ گھنٹے کے بعد کرنل صاحب نے پوچھا'' کیوں کیپٹن سالک War Communique تیار ہو گیا'' عرض کیا'' سر' کوشش کر رہا ہوں'' ''نہیں جیسا ہے جتنا ہے میرے پاس لے آؤ'' میں سادہ پیڈ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہو گیا جس پر سمجھ میں نہ آنے والے چند انگریزی الفاظ اور بہت سی گھوڑے' کتے اور ہاتھی وغیرہ کے لایعنی سے اشکال بنی تھیں جو در اصل میں نے اپنی سوچ کو نکھارنے کے لئے بنائی تھیں۔'' انہوں نے فوراً خطرناک ٹیلی فون اٹھایا جسے وہ مار گلہ فون کہتے تھے۔ اور میرے ڈائریکٹر کو اپنے نسبتاً کمتر عہدے کے باوجود غصے میں کہا۔

'' یہ آپ نے کیا نالائق کپتان بھیج دیا ہے' ایک گھنٹے سے ادھر بیٹھا ہے' ایک لفظ نہیں لکھ سکا۔''

ہمارے ڈائریکٹر صاحب جی ایچ کیو سے ایک ٹیلیفون کھڑ کنے سے بالکل کھڑک گئے کہنے لگے۔

''میں معذرت چاہتا ہوں لیکن یہ ہمارے کپتانوں میں نالائق ترین کپتان ہے۔ ایم۔اے (انگلش) کر رکھا ہے۔اس نے۔ ذرا دیجئے فون اسے' سسرے کو جی ایچ کیو جا کر کیا ہو گیا ہے۔''

انہوں نے فون پر حتی المقدور سخت جھاڑ پلائی اور میری نالائقی کی وجہ پوچھی میں نے انہیں بتایا کہ ان سگنلز کی Vocabularly میری سمجھ سے بالا ہے''میں نے چند مثالیں دے کر اپنی مشکلات کی وضاحت کی۔

''میاں Vocabulary تو وہی ہوگی البتہ Abbreviations ایسے ہوں گے جو تمہیں سمجھ نہیں آ رہے ہوں گے۔''ذرا دیجیو فون کرنل صاحب کو''

پھر انہوں نے کرنل رشید سے فون پر گفتگو کی جس کے بعد مجھے ایک سال خوردہ اور دیمک زدہ جے سی او دیا گیا جو فوجی مخففات سے بخوبی واقف تھا۔اس نے مجھے ان کی کلید سمجھائی اور میں ایسا چالو ہوا کہ پندرہ منٹ میں War Communique لکھ کر کرنل صاحب کو پیش کر دیا۔وہ مجھے اور Communiqe کو بیک وقت...... بلکہ فوراً...... اپنے ڈائریکٹر صاحب کے پاس لے گئے۔میں سوچ رہا تھا اب یہ ڈائریکٹر صاحب میری کوئی شکایت میرے ڈائریکٹر صاحب کے پاس کریں گے لیکن وہ باز رہے۔ انہوں نے کمیونکے کا عینکوں کے نیچے سے بغور مطالعہ کیا اور پھر عینکوں کے اوپر سے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔''کیا نام ہے تمہارا؟''

''کیپٹن سالک''

''کیا تعلیم ہے؟''

''ایم۔اے انگلش اور.......''

''کتنی نوکری ہو گئی ہے۔''

''ایک سال''

''گڈ۔بہت اچھا ڈرافٹ ہے میں نے صرف ایک جگہ پر ایک لفظ بدل دیا ہے۔دن میں دو مرتبہ یہاں آ جایا کرو۔اور War Communiqe تیار کر کے مجھے دکھایا کرو''

میری جان میں جان آئی۔میرے علاوہ میرے ڈائریکٹر صاحب کی نوکری بھی بچ گئی۔میں تو پہلے بھی ہر دو سال بعد ایک نئی نوکری ڈھونڈنے کا عادی تھا' مجھے فکر تھی کہ اس عمر میں بیچارے ڈائریکٹر صاحب کیا کریں گے۔خیر اللہ تعالی نے لاج رکھ لی اور میں War Communique Specialist ہو گیا۔

پھر میں روزانہ چھاتی تان کر جی ایچ کیو جاتا' بڑی مہارت اور سرعت کے ساتھ اعلامیہ تیار کرتا اور سیدھا ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس (DMI) کے پاس لے جاتا۔ اب وہ مجھے اپنے سامنے فال ان (Fall In) کرنے کی بجائے کرسی پر بٹھاتے' کبھی کبھی چائے بھی پلاتے اور اکثر و بیشتر اس جہاد کے بارے میں میری رائے بھی لیتے۔ میں بھی چائے پینے اور رائے دینے میں ہرگز بخل سے کام نہ لیتا۔ چند ہفتوں کی اس رفاقت میں ہماری کپتانی اور ان کی بریگیڈیری کے درمیان فاصلہ خاصا کم ہو گیا۔

میرے تیار کردہ اعلامیہ میں عموماً اس قسم کی اطلاعات ہوتی تھیں کہ مجاہدین نے آج فلاں سیکٹر میں اتنی پیش قدمی کر لی۔ فلاں جگہ مدافعت پر قابو پا لیا' راستے میں ایمونیشن کے اتنے ڈمپ اتنے پل اور اتنی پلیاں اڑا دیں' عوام نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کیا ایک مقامی عورت نے انہیں شربت پلایا وغیرہ۔

ان اعلامیوں کا مقصد مجاہدین کی مجاہدانہ کاروائیوں کے علاوہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کا تعاون بھی اجاگر کرنا تھا۔ کیونکہ پالیسی سازوں کا کہنا تھا کہ یہ جہاد باہر سے نہیں کشمیر کے اندر سے اٹھا ہے یعنی اہالیان کشمیر ظلم و استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جو بیٹھے ہوئے ہیں وہ بھی شربت پلا کر ان کے ساتھ اتحاد ملی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

ڈائریکٹر ملٹری انٹیلی جنس جن سے میرا روز کا واسطہ تھا خاصے خشک اور سنکی قسم کے آدمی تھے' ان کے رفقاء میں سے آج تک کسی شخص نے ان کے روئے مبارک پر ہنسی مسکراہٹ یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ہرگز نہیں دیکھی تھی' میں بھی ان کے سامنے سنجیدہ اور مودب رہتا تھا' ایک دن اعلامیہ پڑھتے پڑھتے وہ اچانک رک گئے' اس اعلامیے میں بہت سے پلوں اور پلیوں کے اڑانے کی خبر تھی' انہوں نے اپنی سرخ پنسل روک کر اچانک کہا'' آپ نے کہیں مقبوضہ کشمیر میں موجود کل پلوں اور پلیوں سے زیادہ تو نہیں اڑا دیئے۔''

میں اس حقیقت کا قائل ہو گیا کہ سنجیدہ سے سنجیدہ چہرے کے پیچھے بھی مزاج کی پھلجڑی ہو سکتی ہے۔

اس نیم سرکاری جنگ اور اس کی در پردہ تشہیر کے سلسلے میں میری ملاقات پنجاب رجمنٹ کے ایک بجیلے میجر صاحب سے ہوئی جن کا نام میجر مجیب الرحمٰن تھا' اسی تجربے کی بنیاد پر وہ ملک کے طویل ترین مارشل لاء میں طویل ترین عرصے تک (پہلے میجر جنرل اور بعد میں لیفٹیننٹ جنرل کے رینک میں) انفارمیشن سیکرٹری رہے۔

مقبوضہ کشمیر میں ہماری یہ بالواسطہ جنگ جاری تھی کہ ہندوستان نے براہ راست پاکستان پر حملہ کر دیا۔ بڑوں کی بڑائی اور کسی سپر پاور کی مفروضہ یقین دہانی دھری کی دھری رہ گئی اور لالے کے ہاتھوں لاہور کو بچانے کے لالے پڑ گئے۔ ہم نے دبی دبی زبان میں سنا کہ مقبوضہ کشمیر والی سکیم در حقیقت دو ہم مشرب دوستوں یعنی ذوالفقار علی بھٹو اور میجر جنرل اختر حسین ملک کی تیار کردہ تھی' ایک کی سیاسی

بصیرت اور دوسرے کی عسکری ذہانت نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جونہی باہر سے تھوڑی سی تحریک ہوگی مقبوضہ کشمیر کے لوگ ہندوستان کے استعماری تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے' ان کی آواز صدائے کشمیر کے ذریعے....... اور ریڈیو پاکستان اور دیگر دوست ممالک کے ذریعے....... دنیا کے کونے کونے تک پہنچ جائے گی جس سے مجاہدین کشمیر کی حمایت میں بین الاقوامی فضا پیدا ہوگی ....اور بالآخر مقبوضہ کشمیر غلامی کی زنجیریں توڑ کر پاکستان کے ساتھ مل جائے گا۔ پتہ نہیں اس خواب میں حقیقت کا رنگ کتنا تھا لیکن یہ خواب یقیناً بہت سے پاکستانیوں کی امنگوں کا آئینہ دار تھا۔

عملاً اس منصوبے کا اثر یہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ ہی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دبی ہوئی آویزش شدت اختیار کر گئی اور بھارت نے شرارتی لڑکے کو سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔

داتا کی نگری کے پرامن شہری ۶ ستمبر کی رات کو پرسکون نیند سوئے ہوئے تھے کہ بھارت نے واہگہ بارڈر پر دھاوا بول دیا۔ سرحد پر پاکستان رینجرز کی چوکیاں حملے کی اطلاع دیکر پسپا ہو گئیں۔ ان کے پیچھے ریگولر فوج کے سرحدی دستے جن کا کام دشمن کی پیش قدمی کو اس حد تک روکنا تھا کہ چھاؤنیوں سے تازہ دم دستے' ٹینک اور توپیں اپنی پوزیشن سنبھال سکیں۔ دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ میجر عزیز بھٹی کی کمپنی چھ دن اور چھ راتوں تک متواتر بی آر بی کے کنارے پر ڈٹی رہی۔ بالآخر وہ وہیں شہید ہوئے اور بہادری کے اعلیٰ ترین اعزاز کے حقدار ٹھہرے۔

جنگ چھڑنے کے بعد پہلا بھرپور حملہ آئی ایس آر پر ہوا جو غیر ملکی صحافیوں' ٹیلی ویژن ٹیموں اور جنگی وقائع نگاروں کی طرف سے تھا۔ ادھر ہم تھے کہ کسی ڈائریکٹر (ڈی پی آر) کے بغیر بے نیل و مرام بھٹکے پھر رہے تھے کیونکہ چند ہفتے پہلے ہمارے اکلوتے کموڈور' سینئو ہیڈ کوارٹر (انقرہ) چلے گئے تھے۔ ان کے ستائے ہوئے بعض ماتحتوں کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ جذبہ حب الوطنی سے مغلوب ہو کر دوبارہ دس پندرہ سال کے لئے ڈائریکٹر کی کرسی پر تشریف نہ لے آئیں۔ لیکن کموڈور صاحب کے قریبی جاننے والوں نے اسے خارج از امکان قرار دیا۔ گورنمنٹ نے ان کا خلا پر کرنے کے لیے کہنہ مشق صحافی زیڈ، اے، سلہری کو فل کرنل کی وردی پہنا کر ڈائریکٹر کی کرسی پر بٹھا دیا۔ ہم جونیئر ان کی آمد سے خاصے خوش ہوئے کہ کوئی ذمہ داری قبول کرنے والا تو ملا البتہ بعض سینئرز کا خیال اس سے مختلف تھا۔

اس دور میں سلہری صاحب کے کئی لطیفے مشہور ہوئے جو نا قابل اشاعت ہیں' البتہ اگر وہ اجازت دیں تو ایک بے ضرر سا واقعہ رقم کر دوں۔

وہ ۱۲ ستمبر کو (جنگ کے عین دوران) لاہور سے راولپنڈی تشریف لائے۔ چارج سنبھالنے کے بعد کرنل کی وردی میں لاہور

تشریف لے گئے اور صحافیوں سے ملے۔ صحافیوں نے ان کی تقرری کا خیر مقدم کیا اور گلہ کیا کہ جنگ کا محاذ ان سے دس پندرہ میل دور ہے لیکن انہیں وہاں جانے کی اجازت نہیں بلکہ انہیں راولپنڈی سے جاری ہونے والے بے لذت اور بے جان اعلامیے پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ سلہری صاحب نے کرسی میں پہلو بدلا۔ کرنیلی کو سیدھا کیا اور نیم غصے کی حالت میں فرمایا۔

You Bloody Civilians do not Realize our Problems

(تم سویلین لوگوں کو ہمارے مسائل کا کوئی احساس نہیں)

دو دن کے اندر اندر سویلین سے مکمل فوجی بننے کی ایسی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔

ذاتی طور پر جنگ ستمبر کا مجھ پر یہ اثر پڑا کہ جی ایچ کیو والی ڈیوٹی سے مجھے چھوٹ مل گئی کیونکہ اب درپردہ جنگی اعلامیے تیار کرنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے سرعام حالت جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ اور اپنی یادگار تقریر میں فرما دیا تھا کہ۔

''اب جبکہ بھارتی حکمرانوں نے اپنی روایتی بزدلی اور منافقت کے ساتھ اعلان جنگ کئے بغیر اپنی افواج کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں گھسنے کا حکم دے دیا ہے۔ ہمارے لئے وقت آگیا ہے کہ بھارتی سامراج کو ختم کرنے کے لیے منہ توڑ جواب دیں۔ لاہور کے بہادر لوگوں کے دشمنوں کو پہلے مقابلے کے لئے چنا گیا ہے۔ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کہ انہوں نے دشمن کی تباہی کے لئے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی۔ پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دل کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپیں ہمیشہ کے لئے خاموش نہ کر دی جائیں۔ بھارتی حکمرانوں نے ابھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ان کا واسطہ کس قسم کی قوم سے پڑا ہے وہ اللہ کے نام پر فرد واحد کی طرح ایمان اور اپنے منصفانہ مقصد کے لئے لڑے گی۔''

اب ہماری ڈیوٹی یہ تھی کہ محاذ جنگ کا رخ کریں۔ کبھی خود جنگی وقائع نگاری کی ڈیوٹی کرنے کے لئے اور کبھی غیر ملکی صحافیوں کو محاذ جنگ دکھانے کے لئے...... ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے آئی ایس پی آر کے کئی کہنہ مشق افسر بھی Recall کر لئے گئے جن میں میجر ابن الحسن' لیفٹیننٹ کمانڈر عسکری اور میجر ضمیر جعفری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ضمیر جعفری ذرا دیر سے پہنچے جب چھمب جوڑیاں فتح ہو چکا تھا میں نے تاخیر کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے ''میرے سائز کی بیلٹ دستیاب نہ تھی' آج دوسری جنگ عظیم کے ایک ریٹائرڈ صوبیدار میجر مل گئے تو ان کی پیٹی مستعار لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ اب جہاں چاہو لانچ کر دو۔''

چنانچہ ہمارے ڈائریکٹر کرنل سلہری صاحب نے میجر جعفری' کیپٹن احسان دانش اور مجھ پر خصوصی نظر عنایت کی اور ہمیں محاذ جنگ کا عینی مشاہدہ کرنے کے کئی مواقع فراہم کئے۔ کبھی تنہا اور اکثر و بیشتر غیر ملکی صحافیوں سمیت!

میں جنگ کے عین عالم شباب میں سیالکوٹ گیا۔ شہر کے اس جانب خلاف توقع بڑا پرسکون ماحول تھا' حقہ کش دیہاتیوں کی ٹولیاں گھنے درختوں تلے خوش گپیوں میں مصروف پرشکم بھینسیں جوہڑوں میں لیٹی جگالی کر رہی تھیں اور تھوڑی دور مرد عورتیں کھیت میں پنیری لگا رہے تھے۔ لیکن میں جونہی شہر کے اس پار چھاؤنی سے ہوتا ہوا سرحد کے قریب گیا تو روایتی میدان جنگ گرما گرم پایا۔ کھیت۔ مٹی' گاڑیوں کے پہیوں کے نشانوں اور ٹینکوں کے Tracks سے اٹے پڑے تھے۔ کہیں کہیں گولے پھٹنے سے زمین میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ میں اسی ماحول میں جیپ دوڑاتا اور دھول اڑاتا ایک بٹالین کے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گیا۔ کسی تعارف کے بغیر وہاں پر موجود چند افسروں نے خوشی خوشی میرا استقبال کیا اور میں جلدی ان میں گھل مل گیا۔

ہم خیمے کے باہر گھنے درختوں کے نیچے کیمپ سٹول پر بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ دشمن کی بھاری توپوں نے گولہ باری شروع کر دی بڑے بڑے گولے سیٹیاں بجاتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگے۔ تمام حاضرین حفاظتی تدبیر کے طور پر چائے کے مگ وہیں چھوڑ کر خندقوں (Trenches) میں کود گئے۔ لیکن میں لاعلمی میں وہیں بیٹھا رہا۔ انہوں نے بڑے اصرار اور سرعت کے ساتھ مجھے خندق کی طرف کھینچا۔ ہم کچھ دیر خندق میں بیٹھے رہے۔ جب گولہ باری تھمی تو دوبارہ ٹھنڈی چائے کی چسکی لینے لگے۔ تھوڑی دیر بعد پھر توپ کے سنسناتے گولے ہمارے سروں کے اوپر سے گزرنے لگے تو اس مرتبہ میں نے پھرتی دکھائی اور سب سے پہلے خندق میں کود گیا۔ باقی حضرات میری اس حرکت پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے بتایا یہ ہماری توپوں کی جوابی فائرنگ تھی اب خندقوں میں کودنے کی باری ہماری نہیں دشمن کی ہے۔ میں نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کے لئے کہا "ہاں' میں بھی سوچ رہا تھا کہ اس مرتبہ گولوں کی سیٹی پہلے کی نسبت سریلی کیوں ہے۔"

چائے پینے اور کوکونٹ بسکٹ کھانے کے بعد میں نے اگلے مورچوں تک جانے کی خواہش ظاہر کی جنہیں فوجی زبان میں FDL'S یعنی Forward Defended Locaties کہا جاتا ہے۔ انہوں نے مشورہ دیا ذرا رک جاؤ جنگ میں ذرا Lull آ جائے تو آپ کو اگلے مورچوں تک لے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک کیپٹن صاحب ڈرائیو سمیت کھلی جیپ لے کر حاضر ہو گئے۔ میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہماری جیپ سے اڑتی ہوئی گرد کو دیکھ کر دشمن غالباً یہ سمجھا کہ کوئی کمک آ رہی ہے اس نے اگلے مورچوں سے چند قدم پہلے ہم پر فائر کھول دیا۔ مشین گن کا ایک برسٹ جیپ کی دائیں پسلیوں کو چھیلتا ہوا پیچھے نکل گیا۔ ہم تینوں جیپ کی اوٹ لے کر زمین پر لیٹ گئے۔ فائر ہماری طرف آتا رہا ہم زمین سے چمٹے رہے۔ میں زندگی بھر دھرتی ماتا سے اتنی شدت کے ساتھ کبھی نہیں چمٹا تھا۔ اتنے میں ہمارے اگلے مورچوں سے تڑاتڑ جوابی فائر ہوا۔ کچھ دیر مکئی کے دانے بھوننے کا شور سنائی دیتا

رہا۔ ذرا وقفہ ہوا تو ہم کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بالکل سامنے والے بنکر (Bunker) سے ایک زخمی سپاہی کو اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ تازہ فائر کے دوران زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے بائیں بازو پر گولی لگی تھی جس سے تیز تیز خون بہہ رہا تھا۔ اس کی خاکی آستین سرخ ہو چکی تھی اور اس نے دائیں ہاتھ کا پیالہ بنا کر اپنی بائیں کہنی کے نیچے رکھا تھا۔ لیکن اس پیالے سے بھی خون ٹپ ٹپ بہہ رہا تھا۔ ہم نے اسے اپنی جیپ میں ڈالا اور پیچھے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں لے آئے۔

پیچھے سیالکوٹ شہر کے اس جانب جگالی کرتی بھینسوں اور پنیری لگاتے شہریوں کو کیا خبر کہ انہیں یہ پر امن ماحول مہیا کرنے کے لئے کتنا تازہ خون کہاں کہاں بہہ رہا ہے۔

اس کے چند روز بعد مجھے ایک پریس پارٹی کے ساتھ راولپنڈی سے چھمب جوڑیاں روانہ کیا گیا' میں نے گجر خان سے لے کر گجرات تک جگہ جگہ سڑک کے کنارے شربت اور دودھ کی سبیلیں لگی دیکھیں۔ ہر باوردی آدمی کو روک کر وہ مشروب پلانے پر اصرار کرتے تھے۔ سبیل کے پاس ہی کھوکھے سے کسی نے ماچس اور سگریٹ کی ڈبیا خریدی تو دکاندار نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

اس ماحول میں بڑے بڑے بینرز لگا کر "پاک فوج کو سلام" کے خیر مقدمی نعرے لگائے گئے تھے۔ ہمیں چھمب جوڑیاں پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے واپس بھی آنا تھا۔ چنانچہ ہم کسی سبیل پر نہ رکے البتہ جب گجرات شہر کے اندر پہنچے تو ایک مائی نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس نے دودھ کا گلاس گرد و غبار سے بچانے کے لئے اپنے میلے دوپٹے میں چھپا رکھا تھا' اس نے مجھے روک کر بڑے اصرار سے کہا "بیٹا' مجھے مایوس نہ کرنا' میں صبح سے یہاں کھڑی ہوں' دودھ کا یہ گلاس پیتے جانا' وہ معصوم سی مائی مجھ جیسے لمبے تڑنگے شخص کو ایف ایف رجمنٹ کی وردی میں دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھی کہ شاید میں ہی وہ جیالا جوان ہوں۔ جس نے وطن کا دفاع کرنا ہے۔ (حالانکہ میں نے ساری جنگ میں ایک گولی بھی نہ چلائی)۔ میں ذرا ہچکچایا تو پیچھے بیٹھے ہوئے ایک بے تکلف صحافی نے کہا "پی اؤ سالک اس مائی کو کیا پتہ کہ تم دودھ پینے والے مجنوں ہو یا خون دینے والے....... اگر نخرہ کرنا ہے تو گلاس میری طرف کرو میں نے مائی کے ہاتھ سے گلاس لیا اور غٹا غٹ پی گیا....... مائی میری بلائیں لینے لگی۔

چھمب پہنچا تو وہاں جنگ سرد پڑ چکی تھی' جنگ کا پلڑا لاہور اور سیالکوٹ کی طرف مڑ چکا تھا یہاں جگہ جگہ مجھے تباہ شدہ ٹینک' بھارتی سپاہیوں کے ترک کردہ مورچے' بکھری ہوئی انسانی کھوپڑیاں اور اکڑے ہوئے فوجی بوٹ دکھائی دیئے....... ان میں سے کون اور کیا پاکستانی تھا اور کیا ہندوستانی' تمیز کرنا مشکل تھا۔ کیونکہ موت بہت سے امتیازات پر حرف تنسیخ پھیر دیتی ہے۔ لیکن وہاں پر موجود فوجی افسروں نے ہمیں بتایا کہ پہلے بھارتی فوجیوں کے مورچے یہاں تھے' ہم نے ادھر سے حملہ کیا' انہوں نے ادھر سے

جواب دیا۔ گھمسان کا رن پڑا' بالآخر وہ پسپا ہوئے اور اپنے پیچھے اتنا اسلحہ اور اتنی لاشیں چھوڑ گئے جبکہ اس معرکے میں ہمارے اتنے ٹینک تباہ اور اتنے افسر اور جوان شہید ہوئے۔

ہم چھمب کی بریفنگ کے بعد دریائے توی کو پار کرتے ہوئے جوڑیاں پہنچے جس کی اخباروں میں بڑی دھوم سنی تھی۔ یہ بھارت کی ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی جہاں وہ ڈٹ کر دفاع کرنا چاہتے تھے لیکن پاک فوج کے زوردار حملے کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ ہم نے ان کے مضبوط مورچوں اور مورچوں کو ملانے والی دفاعی خندق کا بغور مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مضبوط مورچے کمزور دلوں کے لئے سہارا نہیں بن سکتے۔

ہمارے میزبانوں نے تفصیلی بریفنگ کے علاوہ ہماری خاطر مدارت میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی' فیلڈ لنچ کے بعد سبز چائے پر بے تکلفانہ گفتگو ہوتی رہی جس کے دوران چند ایسے سوالات ابھرے جن کے جوابات ہنوز واضح نہیں ہیں

مثلاً۔

ا۔ ستمبر کے ابتدائی دنوں میں اکھنور کی جانب پاک فوج کی پیش قدمی کیوں روک دی گئی اور

ب۔ عین لڑائی کے دوران میجر جنرل اختر حسین ملک کو کمانڈ سے ہٹا کر میجر جنرل یحییٰ خاں کو ان کی جگہ کیوں لگایا گیا وغیرہ۔

ابھی میں دوسرے محاذوں پر نہ جا پایا تھا کہ جنگ بند ہوگئی۔ لہٰذا میں نے جنگ بندی کے دوران اور اس کے فوراً بعد آزاد کشمیر' لاہور' کھیم کرن اور فاضلکا سیکٹر کا دورہ کیا۔ اب وہاں سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات تھی لیکن ہر محاذ پر پہنچ کر وہاں کی تفصیلات سنتا۔ یقیناً یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جس سے مجھے جنگ کی مجموعی صورت حال کو سمجھنے میں خاصی مدد ملی۔

انہی دنوں یعنی سیز فائر کے فوراً بعد کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ بیدیاں سیکٹر کے دورے پر گئے اور وہاں افسروں اور جوانوں سے خطاب کیا' میں ان کے ساتھ پی آر ڈیوٹی پر تھا۔

انہوں نے سرحد کے اس پار کھڑے ہو کر ایک نہایت جوشیلی تقریر کی جو فصیح و بلیغ گالیوں سے بھری پڑی تھی مثلاً ان کی تقریر کا انداز کچھ اس طرح کا تھا۔

''وہ ہمارا دشمن' بزدل کمینہ' رات کی تاریکی میں لاہور پر حملہ کیا شب خون مارا....... بہن....... کہتا تھا کہ لاہور جمخانہ میں پیگ پئے گا وہ کیا سمجھتا ہے کہ ادھر اس کی ماں کا....... بیٹھا ہوا ہے' ہم سویا ہوا نہیں تھا۔ اس کمینے' ذلیل اور بزدل کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ادھر پاکستانی فوج ہے۔ پاکستان کا سپاہی جس کو ساری دنیا جانتی ہے' یہ لالے کا فوج نہیں ہے یہ اسلام کا فوج ہے۔ یہ فوج

کافر کے بچے کا....... کردے گا' اس نے سمجھا کیا ہے۔"

اگلے دن میری جواب طلبی ہوگئی' کمانڈر انچیف کے سٹاف نے ہمارے ڈائریکٹر سے اور ڈائریکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ چیف صاحب ایک گھنٹے تک بولے لیکن اخبار میں صرف دو چھوٹے چھوٹے پیراگراف کی سٹوری آئی ہے۔

عرض کیا کہ "رپورٹنگ کے قابل تقریر کا صرف یہی حصہ تھا۔

"باقی تقریر کہاں گئی؟"

"وہ گالیوں کی نذر ہوگئی۔"

"لیکن چیف کا سٹاف تو کہتا ہے کہ تقریر Motivation سے بھری پڑی تھی۔ اور ٹروپس (Troops) جوش میں آ کر نعرے لگا رہے تھے۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اگر گالیوں اور نعروں کو حذف کر دیا جائے تو تقریر اتنی ہی رہ جاتی ہے جتنی اخبارات میں چھپی ہے۔"

میری جان خلاصی ہوگئی۔

اس کے بعد میں یکے بعد دیگرے دوسرے محاذوں پر گیا جواب سرد پڑ چکے تھے' فاضلکا سیکٹر کا ایک واقع یاد آ رہا ہے۔ وہاں میجر محسن ڈیزرٹ رینجرز کے ایک ونگ کی کمانڈ کر رہے تھے' جو میرے جاننے والے تھے' میں نے انہیں خاصا پریشان پایا' پوچھا کہ "کیا تمہارے چہرے پر ہوائیاں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ جنگ میں تم نے کوئی خاص تیر نہیں مارا۔" اس نے کہا "نہیں ہندوستان کے ساتھ تو ہم نے ٹھیک ٹھاک جنگ لڑی لیکن جنگ کے بعد لاگ ایریا کمانڈر کے ساتھ تازہ جھڑپ میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ بریگیڈیئر صاحب کل تشریف لائے' پچھلے پہر اس علاقے میں شکار کھیلنے نکلے' بھلا بیس دن کی لڑائی کے بعد یہاں کونسے پرندے بریگیڈیئر صاحب کی گولیوں کے انتظار میں بیٹھے تھے لہٰذا انہیں کوئی شکار نہ ملا۔ رات کو کھانے کے بعد یہاں کے فیلڈ ٹیلیفون سے راولپنڈی میں اپنی بیوی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن آواز کمزور تھی۔ صبح اٹھے تو سخت ناراض اور ناشتہ کئے بغیر یہ فتویٰ دے کر چلے گئے کہ

جو افسر اپنے علاقے میں شکار Organise نہیں کر سکتا اور جس کا Communication اتنا Poor ہے کہ سلیقے سے راولپنڈی بات نہیں ہو سکتی وہ کیا خاک لڑائی لڑے گا۔ نالائق ناہنجار نا قابل اعتماد....... وغیرہ۔

میں نے میجر محسن کو تسلی دی کہ ایسی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا اس نے کہا "ہوتا ہے' تمہیں نہیں پتہ یہی کمانڈر میرا رپورٹنگ آفیسر بھی

ہے۔میری سالانہ رپورٹ خراب کردے گا۔عرض کیا ''رپورٹوں میں رزق لکھا ہے نہ پروموشن' یہ سارے معاملات اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔''

میرے وعظ کے باوجود میجر محسن اپنے موجود عہدے سے آگے نہ بڑھ سکے اور چند سال بعد اسی رینک میں ریٹائر ہو گئے۔کیا پتہ وہ سچ مچ سمجھنے لگے ہوں کہ ترقی اور رزق افسر بالا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔اللہ نہ کرے!

◆◆◆

جنگ ستمبر۔۲

پیچھے راولپنڈی میں جنگ کا انداز سراسر مختلف تھا' یہاں جنگ کی سب سے نمایاں علامت راتوں کا بلیک آوٹ اور دن کے سائرن تھے جو دشمن کے فضائی حملوں کی خبر دیتے تھے۔لوگوں کا مورال بہت بلند اور ان کا جذبہ ایثار معراج پر تھا' لوگ ازخود اپنی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس پر کیچڑ تھوپتے' اشیائے ضرورت کفالت کے ساتھ خریدتے اور حتیٰ الامکان اپنے فوجی بھائیوں کی مدد کرتے۔یہ جذبہ اور نظم وضبط دیکھ کر ہی ایک غیر ملکی اخبار نویس نے لکھا تھا کہ ایسی بہادر اور منظم قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

البتہ راولپنڈی سے کوئی دس میل جنوب میں سہالہ کیمپ میں مجھے ذرا مختلف تجربہ ہوا' وہاں رائفل بردار مجاہدوں کا ایک عظیم لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا' وہ کافر کے خلاف لڑنے کے لئے آگے محاذ پر جانے کے لئے بیتاب تھے لیکن دفاعی نقطہ نظر سے کوئی رکاوٹ ان کے راستے میں حائل تھی۔ادھر غیر ملکی صحافیوں کا جم غفیر آئی ایس پی آر کے اعصاب پر سوار تھا کہ ہمیں محاذ جنگ پر کیوں نہیں جانے دیا جاتا۔حکام بالا نے سوچا جو پریس پارٹی فی الحال محاذ پر نہیں جاسکتی' اسے محاذ پر جانے کے لئے بے تاب لشکر سے ملوادیا جائے مجھے اس پارٹی کا کنڈکٹنگ آفیسر (Conducting Officer) مقرر کیا گیا۔

میں دس پندرہ صحافیوں کی پارٹی لے کر کوئی تین بجے سہ پہر سہالہ کیمپ پہنچا۔اس پارٹی میں ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندوں کے علاوہ پریس فوٹو گرافر بھی تھے۔میں نے وہاں سفید بش شرٹ والے ایک اہلکار کو الگ بلا کر بریف کیا اور کہا کہ ''وہ چار پانچ ایسے لشکری منتخب کرے جو ان غیر ملکی صحافیوں کو اس نوع کا انٹرویو دے سکیں کہ ہم قبائلی علاقے سے آئے ہیں اور کافر کے بچے کو شکست دینا چاہتے۔یہ رائفل ہمارا ہے' سفر کے لیے یہ ٹرک ہمارا ہے' ایمونیشن ہمارا ہے' ہم اپنے مسلمان بھائی کا مدد کرنے کے لیے بیتاب ہیں لیکن حکومت وقت ہمیں آگے جانے نہیں دیتا۔ہم مجاہد ہے' ہمارا کام جہاد ہے' ہمیں پیسہ نہیں' روٹی کپڑا نہیں چاہیے' بھتہ اور خطوط نہیں چاہیے صرف اجازت چاہیے کہ ہم اس کافر کے بچے کو اسلامی پاکستان پر حملے کا مزہ چکھادے۔''

کوئی دس پندرہ منٹ بعد وہ چار پانچ قبائلیوں کو یہ ڈائیلاگ پڑھا کر ٹاہلی کے نیچے لے آیا۔میں نے صحافی جمع کیے' خود ترجمان کے فرائض سنبھالے انہوں نے اپنے کیمروں کی آنکھیں اور ٹیپ ریکارڈروں کے منہ کھول دیئے اور مقررہ خطوط پر انٹرویو شروع ہو گیا۔یہ کوئی منظم انٹرویو نہیں تھا کیوں کہ قبائلی ایک دوسرے کی بات کاٹ رہے تھے لیکن وہ سب بات ایک ہی کہہ رہے تھے' ان کی

گفتگو کے علاوہ ان کا جوش و جذبہ دیدنی تھا اور میں بہت خوش تھا کہ جب دنیا یہ انٹرویو دیکھے گی یا سنے گی تو عش عش کر اٹھے گی' اتنے میں ایک قبائلی اپنی رائفل ہوا میں لہراتا ہوا اس چھوٹے سے جھرمٹ میں آوارد ہوا اور سرکاری اہلکار کی سفید بش شرٹ کا گریبان پکڑ کر کہنے لگا "تم نے ہم کو ادھر کیوں رکھا' نہ دوپہر کا روٹی' نہ پانی' نہ چائے نہ نسوار' ہم ادھر نہیں رہے گا' آگے جائے گا یا واپس جائیگا۔"

یہ ساری باتیں ساونڈ کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر میں منجمد ہو گئیں۔ بکے بکے غیر ملکی صحافی میری طرف دیکھنے لگے کہ ماجرا کیا ہے؟ عرض کیا" کہ یوں تو یہ قبائلی بڑے Disciplined ہیں' لیکن اس بھائی کا صبر و تحمل جواب دے گیا ہے' وہ محاذ جنگ پر جانے کے لئے اتنا بیتاب ہے کہ بیچارے سرکاری اہلکار پر اپنا غصہ نکال رہا ہے حالانکہ محاذ جنگ پر بھجوانے میں اس غریب کا کوئی ہاتھ نہیں" وہ "اوہ آئی سی...... اوہ آئی سی" کہہ کر خاموش ہو گئے۔

واپس میں نے سنسر شپ کی آڑ میں ان کی فلمیں اور ٹیپ ان سے لے لئے اور قابل اعتراض حصے نکال کر ان کا مال ان کو لوٹا دیا۔

راولپنڈی میں ہماری دوسری اہم ڈیوٹی پریس سنسر شپ تھی' پوسٹل سنسر شپ کا کام کسی اور کے سپرد تھا' پریس سنسر کے دو حصے تھے ایک ملکی اخبارات و جرائد جنہیں سول کا انفارمیشن ڈپارٹمنٹ چلاتا تھا اور دوسرا غیر ملکی صحافیوں کے Despatches کی چھان پھٹک کہ وہ کوئی ایسی چیز بیرون ملک نہ بھیج دیں جو ہمارے قومی مفادات کے منافی ہو۔

سنسر شپ زمانہ امن کا ہو یا زمانہ جنگ کا' اس میں ایک بنیادی قباحت یہ ہوتی ہے کہ اس کام پر عموماً جونیئر آفیسر لگائے جاتے ہیں جو کوئی تحریر کلیئر کرتے وقت اسی خوف سے لرزتے رہتے ہیں کہ اگر اس کی اشاعت پر کل افسران بالا نے نوٹس لے لیا' تو ہمارا کیا بنے گا' لہذا وہ ضرورت سے زیادہ احتیاط برتتے ہیں اور بعض اوقات لطیفوں کا باعث بنتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک پاکستانی اخبار کی رپورٹ اور غیر ملکی اخبار نویس کے مراسلے پر سنسر اتھارٹی کا ردعمل ملاحظہ ہو۔

ایک پاکستانی صحافی نے اپنے اردو اخبار کے لئے چھمب جوڑیاں کے محاذ کا دورہ کرنے کے بعد ایک فیچر لکھا جس میں میدان جنگ کی عکاسی کے علاوہ وہاں کے تباہ شدہ مکانات اور ان کے بے بس باسیوں کی حالت کا ذکر بھی تھا۔ اس فیچر کے اس جملے پر سنسر آفیسر اٹک گیا اور کہنے لگا یہ جملہ نہیں جائے گا کیونکہ اس میں قابل اعتراض الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جملہ یہ تھا۔ "پھر جنگ بندی کے بعد وہ برہنہ پا واپس گاؤں آئی۔ اپنے گھر کی دیواروں کو حسرت سے دیکھا' دروازے پر بوسہ دیا اور واپس چلی گئی۔"

ایک غیر ملکی صحافی نے اپنے جنگی مراسلے میں لکھ بھیجا کہ میں ہندوستان کے ایک سرحدی قصبے کھیم کرن میں کھڑا اپنے مشرقی جانب پاکستانی افواج کی پیش قدمی دیکھ رہا ہوں' سنسر پر تعینات ایک نوجوان افسر نے یہ مراسلہ اس لئے روک لیا کہ اس میں کھیم کرن کو

بھارتی قصبہ کہا گیا تھا جب کہ بقول اس افسر کے یہ اب ہمارا شہر بن گیا تھا' اسے بھارتی قصبہ کہنا ہماری فتح کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔اس کے برعکس ایک اور مراسلہ کلیئر کر دیا گیا' جس کے پہلے جملے میں تو تعریف تھی لیکن آگے خاص ضرر رساں قسم کی رپورٹنگ تھی۔ جملہ کچھ یوں تھا کہ ''میں نے چونڈہ کے میدان میں پاکستان کے جیالے افسروں اور جوانوں کے درمیان کھڑے ہو کر وہ میدان دیکھا جو پاکستانی ٹینکوں کا قبرستان بن چکا ہے۔''

اس قسم کی چھوٹی موٹی بے قاعدہ گیوں کے باوجود سنسر شپ کا کام بخیر وعافیت چلتا رہا' اچانک ایک دن کسی غیر ملکی نشری ادارے نے ایک نہایت ہی تباہ کن رپورٹ نشر کر دی جو اگلی صبح ریڈیو پاکستان کی تیار کردہ Monitoring Report میں تمام افسران بالا تک پہنچ گئی' خاصا ہنگامہ ہوا' سنسر اور کلیرنس ڈیوٹی پر فائز عملے کی کھچائی ہوئی۔ کچھ سوال وجواب مجھ سے بھی ہوئے' ہر کسی نے ایسی خبر سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ متعلقہ صحافی نے ٹیلی فون' ٹیلکس' اور ٹیلیگرام Voice Cast کے معروف ذرائع استعمال کرنے کی بجائے اپنے ملک کے مقامی سفارت خانے میں موجود سہولتوں کو استعمال کیا جو قانون کے سراسر خلاف تھا۔ متعلقہ سفارت خانے کو تنبیہ کی گئی اور متعلقہ صحافی کو پاکستان سے خارج کر دیا گیا۔ وہ سرحد کے اس پار بھارتی فوج کے ساتھ محاذ جنگ تک آ پہنچا اور ہمارے خلاف خاصی موثر رپورٹنگ کرنے لگا۔

ان دنوں ہم سب کی باری باری نائٹ ڈیوٹی لگتی تھی۔ ڈیوٹی روم میں دو ٹیلی فون اور ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا' اصل کام تو ٹیلی فون سننا' صحافیوں سے رابطہ رکھنا اور افسران بالا کو صورت حال سے آگاہ رکھنا تھا لیکن جب رات خاصی بھیگ جاتی تھی تو ہم صوفے پر لیٹ کر کمر بھی سیدھی کر لیتے تھے۔ ان دنوں ابھی شراب بند نہیں ہوئی تھی اور کئی اصحاب رات گئے تک ملحقہ راولپنڈی کلب میں شراب پیتے رہتے تھے۔ ہمارے ایک اعلیٰ آفیسر آدھی رات کو اس شغل سے فارغ ہوئے تو انہیں اپنا فرض یاد آیا' انہوں نے سوچا ذرا ڈیوٹی آفیسر کی خبر لیتا جاؤں' اس رات میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں نے رات کے اندھیرے میں قدموں کی چاپ سن کر انہیں للکارا تو وہ رک گئے' اپنی شناخت کروائی اور اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئے ان کی توند سے بسیار خوری اور ان کے منہ سے بسیار نوشی کے آثار نمایاں تھے' انہوں نے فرمایا۔ ''ہماری یعنی میری اور ان کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہم اس آڑے وقت دفاع وطن کی اہم ذمہ داری نباہ رہے ہیں۔ یہ یادگار لمحے بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں' یوں تو انسان سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن بہادروں کے ساتھ اور بہادری کے ساتھ چند لمحے گزار لینا بھی بہت بڑی سعادت ہے۔''

وہ مجھے یہ Motivational Talk دے ہی رہے تھے کہ سائرن بجا' جو اس بات کا اعلان تھا کہ بھارت کے جنگی جہاز

آ گئے۔ ہم بھاگ کر لان میں کھودی ہوئی حفاظتی خندق میں کود گئے۔ جہاز دندناتے ہوئے پشاور کی طرف نکل گئے۔ ان کی گڑگڑاہٹ مدھم پڑ گئی لیکن خطرہ ٹلنے کا سائرن ابھی نہ بجا تھا' ہم خاصی Tension میں تھے' انہوں نے پہلے تو ضبط کیا پھر ان سے نہ رہا گیا۔ وہ کہنے لگے۔ ''باتھ روم کدھر ہے!'' شراب نوشی کیسے آڑے وقت اپنا اثر دکھانے لگتی ہے۔

سورج طلوع ہوا تو وہی افسر ہشاش بشاش وردی پہنے بڑے اعتماد سے اپنی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ میں بھی کوئی ایک گھنٹے کی بریک کے بعد دفتر آ گیا۔ انہوں نے گزشتہ رات کے واقعہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے مجھے بڑے تحکمانہ لہجے میں احکامات سنائے جو میں نے روائتی ماتحتانہ انداز میں قبول کئے اور بڑے برخوردارانہ طریقے سے پورے کئے۔ لیکن احکام دینے کی اصلیت مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔

جنگ کا ایک اور محاذ جس کے ذکر کے بغیر معرکہ ستمبر کا یہ اجمالی ساخاکہ مکمل نہ ہوگا۔ ہمارے ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کا محاذ تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے کوئی دس برس قہوہ خانوں اور ٹی ہاؤسوں میں ان کے ساتھ گزارے تھے' ان میں سے اکثر بڑے زیرک' عالم اور معاملہ فہم لوگ ہوتے تھے' لیکن چند ایک بالکل پوستی لگتے تھے جو ساری ساری شام قہوہ خانے کے ایک کونے میں بیکار بیٹھے سگریٹ اور چائے پھونکتے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر کی انگلیاں متواتر سگریٹ نوشی کی وجہ سے پیلی پڑ چکی تھی اور ان کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا' لیکن اس معرکہ حق و باطل نے پتہ نہیں کیا جادو جگایا کہ اس خاکستر کی ساری چنگاریاں تڑپ اٹھیں' رعشہ سے کانپتے ہاتھ اپنے قلم کے زور سے ضرب کاری لگانے لگے' جن کو اللہ تعالیٰ نے شاعری کا ملکہ دیا تھا انہوں نے شعر و شاعری کے ذریعے گولہ باری کی' جن کو خدائے بزرگ و برتر نے خوبصورت آواز بخشی تھی' انہوں نے آواز کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور جن کو فیچر' ریڈیو ڈرامے اور مضمون لکھنے کی صلاحیت نصیب تھی۔ انہوں نے اپنا یہ جوہر نثر میں استعمال کیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے یوں محسوس ہونے لگا کہ سرحد پر صرف پیشہ ور سپاہی ہی سینہ سپر نہیں' پیچھے ملک کے دانشور' صحافی' شاعر' کسان' صنعت کار' مزدور اور گلوکار سبھی اس جنگ میں شریک ہیں۔

یہ اسی اتفاق و اتحاد کا کرشمہ تھا کہ دشمن لاہور جمخانے میں چھوٹا پیگ پینے کی بجائے خون کے گھونٹ پی کر پسپا ہو گیا اور پاکستانی قوم فتح و شکست کی اندرونی کہانی۔ جانے بغیر فتح کے نشے میں سرشار ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس پس منظر میں نہ تو ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ بندی کو خوش دلی سے قبول کیا اور نہ چھ ماہ بعد اعلان تاشقند پر صاد کیا۔

اس دور کی سپرٹ جو ہمارے شعراء کی شاعری میں منعکس ہوئی' ہمارا عظیم ثقافتی ورثہ ہے۔ اس شاعری کے چند اقتباسات یاد

دہائی کے طور پر پیش خدمت ہیں۔

ہمارے جوانوں کی کیا بات ہے

طلسمات ہے

شکایت نہ شکوہ، نہ کوئی گلہ

ہنسی ان کے چہروں پہ بکھری ہوئی

فضا جس طرح چاند کے نور میں دور تک

نظر آئے نکھری ہوئی

انہیں خدمت قوم مطلوب ہے، مرغوب ہے

نہیں مانگتے وہ صلہ

ہمارے جوانوں کی کیا بات ہے

کرامات ہے

صور محشر ہوں

مجھ کو کل کائنات سن لے

سنو

مجھے نہ کوئی ہرا سکا ہے

مجھے نہ کوئی ہرا سکے گا

کوئی بھی مجھ پہ نہ غالب آیا

کوئی بھی غالب نہ آ سکے گا

مجھے نہ کوئی مٹا سکا ہے

مجھے نہ کوئی مٹا سکے گا

چلو واہگے کی سرحد پر

وطن پر وقت آیا ہے
وطن پر کٹ کے مرجانے کا یاروں وقت آیا ہے
چلو وا ہگے کی سرحد پر
زمین پاک جس پر غیر کا سایا نہیں منظور
اس پر سامراجی وحشیوں کو پاؤں ہم رکھنے نہیں دیں گے
چلو وا ہگے کی سرحد پر
جو ہاتھ اٹھے ہیں ہم پر۔ کاٹ دو
ناپاک جسموں کو فنا کر دو

وطن کے نونہالو باندھ کر سر سے کفن آؤ
ادھر اے وارثان حیدر خیبر شکن آؤ
عدو کی پیش قدمی روک دو پتھر کی دیوار
بڑھو تلوار کے بیٹو تیر کی آنکھ کے تارو

جب کافروں پر جھپٹے ہو رن میں
جاگے ہیں شعلے تن اور بدن میں
جبریل تم کو دیتا ہے شہپر
اللہ اکبر ------ اللہ اکبر

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں
میں سحر ہوں میں اجالا ہوں حقیقت ہوں میں
میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب
لیکن اعدا کے لئے قہر و قیامت ہوں میں

صرصر کی زد میں آ کے بھی روشن ہے اک چراغ

جنگ ستمبر کے بعد ایبٹ آباد میں پفر ز آفیسرز کی ری یونین ہوئی جس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شراب کی فراوانی ختم ہو چکی تھی۔ دو سال پہلے جب میں یہاں کسی بھی پارٹی میں شامل ہوتا تھا تو کوکا کولا کا گلاس پکڑ کر الگ تھلگ کھڑا ہو جاتا تھا جبکہ محفل کے اکثر شرکاء اپنی افسری کی آب و تاب چمکانے کے لئے جام و خم لنڈھاتے تھے۔ اب ان کی اکثریت میری ہم مشرب تھی اور اکا دکا شراب نوش افسر الگ تھلگ اپنا پیگ تھامے گناہ بے لذت کر رہا تھا۔

میں نے اس تبدیلی پر ایک ساتھی افسر سے تبادلہ خیال کیا' تو اس نے بتایا کہ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم میں شراب کا مصرف فی افسری معرکہ کہیں زیادہ تھا کیونکہ اس وقت عام تصور یہ تھا کہ آج کی شب خوب عیش کر لو پتہ نہیں کل صبح کون سی گولی پر آپ کا نام لکھا ہو اور وہ آپ کا حسرت بھرا سینہ چیرتی ہوئی نکل جائے۔ اس کے برعکس حالیہ جنگ کے دوران ہمارے اکثر افسروں کے دلوں میں یہ احساس جاگا کہ اب بھی وقت ہے شراب اور دیگر فروعات سے توبہ کر لو پتہ نہیں کس وقت موت آ جائے اگلے جہان شرابی چہرے پر شہادت کا جبہ کیسے سجاؤ گے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنگ کے دوران نماز اور ڈاڑھی کا تناسب عام حدود سے تجاوز کر گیا اور شراب محدود ہو گئی۔

دوسری تبدیلی یہ دیکھی کہ لوگ اپنے حقیقی اور خیالی معاشقے بیان کرنے کی بجائے بڑے عزت و احترام کے ساتھ اپنے شہید ساتھیوں کو یاد کر رہے تھے۔ وہ مجھ جیسے لوگوں کو جو محاذ جنگ سے دور رہے تھے' ان بہادروں کے ایمان افروز واقعات سنا رہے تھے۔ ایک صاحب نے اپنے ساتھی افسر کا واقعہ سناتے ہوئے بتایا۔

ان کے ساتھ ایک نوجوان کیپٹن مجید ہوا کرتا تھا' وہ اپنے سپاہیوں FDL'S میں تھا' دشمن کی متواتر گولہ باری سے ٹیلی فون لائنیں ٹوٹ چکی تھیں' ایک گولہ وائرلیس سیٹ پر گرا اور اسے ناکارہ کر گیا۔ یوں اس کا رابطہ پچھلے ہیڈ کوارٹر سے بھی ٹوٹ گیا اور اگلے مورچوں سے بھی' اس جنگ و جدل میں اسے محسوس ہوا کہ ایک برسٹ رائٹ پوزیشن کی طرف گیا ہے اور جواباً ہمارے مورچوں سے فائر نہیں ہوا' وہ اپنے مورچے سے اٹھا اور انتہائی خطرہ مول لیتے ہوئے رائٹ پوزیشن پر پہنچا' دیکھا کہ ہمارے دونوں سپاہی شہید ہو

چکے ہیں لیکن لائٹ مشین گن الٹی گری پڑی ہے اور گولیوں کا بیلٹ اس میں لٹکا ہوا ہے' اس افسر نے ایل ایم جی سنبھالی' جوابی فائر کیا اور دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا۔

تیسری اہم تبدیلی یہ دیکھنے میں آئی کہ سینئر اور جونیئر کے درمیان موٹی دیوار جنگی تپش کی وجہ سے خاصی پگھل چکی تھی' اب اس کے آر پار آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا اور ایک سینئر آفیسر جو عموماً اپنی غلیظ اور غلط انگریزی کا سہارا لیتا تھا' اب جونیئر کے پاس جا کر مہذب لہجے میں اس سے ہمکلام ہو سکتا تھا' مثلاً مذکورہ تقریب میں کھڑے کھڑے ایک بریگیڈئر صاحب ہاتھ میں جوس کا گلاس تھامے میرے پاس آئے اور فرمانے لگے۔

''ہیلو سالک' کیا حال ہے؟

''جی' خیریت سے ہوں''

''آپ کے آرٹیکل پڑھتا رہتا ہوں' خوب لکھتے ہو.......

''جی شکریہ''

''پچھلے روز میں جہلم سے پنڈی آ رہا تھا' اچانک کار کا ریڈیو کھولا تو فورسز پروگرام میں کوئی صاحب تقریر کر رہے تھے' آواز تم سے ملتی جلتی تھی۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''جی سر! صدر مملکت تو ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو قوم سے خطاب کرتے ہیں' میں مہینے کے آخر میں.......''

اس پر انہوں نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ ایک جونیئر کپتان کی بات پر ایک سینئر بریگیڈئر کا یوں قہقہہ لگانا یقیناً جنگ کے کمالات سے ایک کمال تھا۔

اس تقریب میں پیشہ ورانہ امور نپٹانے کے علاوہ شہداء کے لئے فاتح خوانی کی گئی۔ ان کی یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا اور شہداء کے پسماندگان کے لئے ایک ویلفیئر فنڈ بھی قائم کیا گیا۔

پیچھے راولپنڈی میں بھی جنگ نے ایک متین اثر Sobering Effect یہ چھوڑا کہ لوگ انگریزی بولنے سے تو باز نہیں آئے تھے لیکن شراب پینا اب فیشن نہ رہا تھا' یہ ایک نیا رجحان تھا جس کو جنرل یحییٰ خان بھی نہ بدل سکے جنرل یحییٰ خان نے ۱۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا۔

چھ ماہ قبل وہ میجر جنرل تھے' کسی کی نگاہ کرم ایسی پڑی کہ انہیں کوئی آٹھ جرنیلوں کے اوپر سے ترقی دے کر لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا

گیا اور اسی وقت ڈپٹی کمانڈر انچیف لگا دیا گیا۔ چند ماہ بعد وہ فور سٹار جنرل اور پکے کمانڈر انچیف بن گئے۔

آئی ایس پی آر افواج پاکستان کے نئے سربراہوں کی تقرری پر ان کے سوانحی خاکے اور تصویر اخبارات کو جاری کرتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی جنرل یحیٰی خان کے بنیاد کوائف مہیا کئے گئے اور میں ان کا سوانحی خاکہ تیار کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ محض ۳۴ برس کی کچی پکی عمر میں بریگیڈیئر ہو گئے تھے۔ میں نے دیگر باتوں کے علاوہ ان کے خاکے میں یہ نکتہ اجاگر کیا تو ڈائریکٹر صاحب نے اس پر اس فقرے کا اضافہ کر دیا کہ ''یہ سیمابی عروج ان کی غیر معمولی صلاحیتوں اور اعلیٰ پیشہ ورانہ مہارت کی غمازی کرتا ہے۔''

میں نے جنرل یحیٰی خان کے دیگر کوائف میں یہ بھی لکھ دیا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے اور ان کے بیوی بچے ہیں (لیکن اس جملے کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا)

اس وقت واقعی ان کا امیج ایک ذہین' قابل اور فرض شناس آفیسر کا تھا۔ میں نے کوئی بیس سال بعد (گورنر ہاؤس کوئٹہ) میں جنرل موسیٰ سے پوچھا کہ انہوں نے ایسے باصلاحیت آفیسر کو کمانڈر انچیف مقرر کرنے کی سفارش کیوں نہ کی' انہوں نے فرمایا۔ ''میں جانتا تھا کہ یحیٰی خان اس وقت تک اچھا افسر ہے جب تک وہ کسی سینئر افسر کی زیر نگرانی کام کر رہا ہے۔ اگر وہ ٹاپ پوزیشن پر پہنچ گیا' تو اپنے اوپر کنٹرول نہیں رکھ سکے گا اور گڑبڑ کریگا۔''

جنرل یحیٰی خاں پہلے دن کمانڈر انچیف کی کرسی پر بیٹھے تو ہم نے اس تاریخی واقعے کی ایک تصویر بنا کر اخبارات کو ریلیز کر دی۔ چھاپی تو سب اخبارات نے لیکن ایک مقامی انگریزی روزنامے نے صفحہ اول پر تین کالمی الٹی تصویر لگا دی۔ اس روز ڈی پی آر دفتر تو آئے' لیکن ایک جھلک دکھا کر کسی اہم میٹنگ کے بہانے تشریف لے گئے اور مجھے قلعہ سنبھالنے (Hold the Fort) کے لئے اپنے دفتر میں بٹھا گئے۔

اس کے بعد سرخ' نیلے' پیلے سارے ٹیلی فون بجنے لگے اور ہر ٹیلی فون پر ایک سے ایک انوکھی جھاڑ اس بے چارے کپتان کو سہنا پڑیں' میرا خیال ہے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۶ء کو صبح کو جتنی جھاڑیں مجھ فرد واحد پر پڑی' شاید ۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء کو اوجھڑی کیمپ پھٹنے سے اتنے بم اور میزائل اہالیان راولپنڈی و اسلام آباد پر نہ برسے ہوں گے۔ ان کی مزاج پرسی اور مدد کے لئے تو صدر مملکت اور وزیر اعظم سے لے کر بھی لوگ آئے' لیکن میری مدد کو کوئی نہ پہنچا' میں تنہا بارش سنگ و شنام سہتا رہا۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن! جھاڑوں کی بوچھاڑ کچھ اس نوعیت کی تھی۔

''کدھر ہے' تمہارا ڈی پی آر؟

''وہ کسی میٹنگ میں تشریف لے گئے ہیں''

''دیکھا ہے آپ نے انگریزی اخبار؟''

''جی سر''

''جی سر کے بچے' یہ ہے تمہارا کنٹرول اخبارات پر چیف کی تصویر الٹی چھاپ دی''

دوسری پھوار اس قسم کی تھی

''کون....... کیپٹن سالک' کون............. کیپٹن سالک۔ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟''

''جی ڈی پی آر صاحب ذرا باہر گئے ہیں''

''یہ کیا مذاق ہے' تم لوگ چیف کی تصویر درست طریقے سے چھپوا نہیں سکتے ہو' شرم سے ڈوب مرو اور اپنا پی آر سمیٹ کر گھر چلے جاؤ''

''یس سر''

تیسری دھاڑ کا انداز کچھ اس نوعیت کا تھا۔

''تم نے جی ایچ کیو کے جاری کردہ ڈریس ریگولیشن پڑھے ہیں؟''

''جی سر''

''اس میں کیا لکھا ہے کہ چھاتی پر ربن اور بازو پر فارمیشن سائن کس طرف پہنا جاتا ہے؟''

''بائیں جانب''

''تو اخبار میں الٹا کیوں چھپا ہے۔''

میں نے رکتے رکتے کہہ ہی دیا جو شروع سے کہنے کی کوشش کر رہا تھا یعنی ''ہم اخبارات کے مالک یا ایڈیٹر نہیں ہیں''

''تو تنخواہ کس چیز کی پاتے ہو۔ نکمے' احمق' بیوقوف....... ''

اس مصیبت میں' میں نے ''چیک اپ'' کا سہارا لینے کی بڑی کوشش کی لیکن یہ نسخہ کارگر نہ ہوا۔ دراصل جھاڑ بوچھاڑ اتنی تند و تیز تھی کہ اس کے سامنے کوئی بھی بند باندھنا مشکل تھا۔

اتنے میں ایک نسبتاً سینئر رفیق کار اتفاقاً ادھر سے گزرا' تو میں نے اسے روک کر اپنی بپتا سنائی اور کہا کہ اتنا تو روڈ رولر سڑک پر

بجری پکی نہیں کرتا جتنی آج میری کپتانی پکی کی گئی ہے۔۔اب کسی کا فون آیا تو میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ۔۔۔''

اس نے مجھے حوصلہ اور دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''اونہہ! ہرگز ایسی حرکت نہ کرنا''

''لیکن تصویر الٹی چھپ جانے میں ہمارا کیا قصور ہے''

''قصور ہو نہ ہو' جھاڑ کھانا آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا سینئر کا جھاڑ پلانا''

پھر انہوں نے More over لہجے میں کہا۔

''Never Forget that Senior is Always Right''

میں یہ جاننے کے لیے بڑا بیقرار تھا کہ جس شخص کی تصویر الٹی چھپنے سے مجھ پر یہ گزری ہے' اس کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ چند ہی روز کے بعد مجھے ان کے ایک سٹاف آفیسر نے بتایا کہ جنرل یحییٰ تصویر دیکھ کر کھل کر ہنسے' اپنے آپ کو کرسی کی پشت پر پھینکا اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔

'' Oh! This is How The National Press Has Greeted My appointment''

(اخاہ' یہ ہے جس طرح قومی پریس نے میری تقرری کو لیا ہے)

مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ اس سے اگلا جملہ ذرا قبل از وقت ہونے کی وجہ سے پی گئے ہیں' ورنہ وہ کہہ سکتے تھے کہ۔

''قومی پریس نے میری تصویر الٹی چھاپی ہے' میں پوری قوم کو الٹا کر دوں گا۔اس کو بھی اور اس کے قومی نقشے کو بھی''

جب جنرل یحییٰ خان کمانڈر انچیف تھے' تو اسی دور میں میجر جنرل کاکا خان ان کے کوارٹر ماسٹر جنرل مقرر ہوئے۔اس سے قبل انہوں نے تھوڑی سے شہرت رن آف کچھ اور جنگ ستمبر کے حوالے سے پائی تھی لیکن دو سال بعد مشرقی پاکستان کے حوالے سے جو ''نیک نامی'' ان کی منتظر تھی اس سے وہ ہنوز محفوظ تھے۔

وہ ایک اچھے' موثر اور دیانت دار کیو ایم جی سمجھے جاتے تھے' انہوں نے ایم ای ایس کے ذریعے ٹھیکداروں کے ہاتھوں میں کھیلنے کی بجائے براہ راست نامی گرامی تعمیراتی کمپنیوں کو بلوایا' ان کے جذبہ حب الوطنی کو ابھارا' ان کی شہرت اور نیک نامی کی تعریف کی اور کہا کہ ہم نے افسروں کے لئے بنگلے وبنگلے بنانے ہیں' تم کیا مدد دو دکر سکتے ہو۔انہوں نے پیشکش کی' انہوں نے چھان بین کی اور چند سالوں کے اندر اندر سمارٹ بنگلے سطح زمین پر ابھر آئے۔جنہیں آج بھی ''بھواتی ٹائپ بنگلے'' کہا جاتا ہے۔ان میں سے ایک بنگلہ

مجھے بھی نصیب ہوا۔ اس بنگلے میں بڑی خوبیاں تھی' اوپر تین بیڈ روم تھے' نیچے ڈرائنگ' ڈائننگ اور گیسٹ روم' کچن نیچے تھا' جس کی بو با آسانی سارے بنگلے میں پھیل جاتی تھی' ڈرائنگ روم میں بیٹھا مہمان با آسانی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کی تواضع کے لئے دال پک رہی ہے یا مرغ مسلم اور اسی اطلاع کے مطابق مزید رکنے یا چلے جانے کا ارادہ باندھ سکتا ہے۔ اس معمولی سے نقص کے علاوہ ایک اس سے بھی معمولی نقص تھا اور وہ یہ کہ غسل خانے میں لگا ہوا شاور بہت کم پانی دیتا تھا۔ اور میرے جیسا آدمی (۲+۶ فٹ) خاصی دیر میں بھیگتا تھا۔ باقی ہر لحاظ سے بنگلہ عالی شان اور آرام دہ تھا۔

جنرل لکا خان نے ایک سرکلر خط ان افسروں کے نام بھیجا جو ان نئے بنگلوں میں رہتے تھے۔ انہوں نے اس خط کے ذریعے پوچھا کہ بتایئے استعمال کنندہ کے طور پر آپ کو یہ بنگلہ اپنی ساخت اور افادیت کے لحاظ سے کیسے لگا۔ میں نے بھی دوسرے افسروں کی طرح اس کی مدح سرائی کے بعد مذکورہ دو نقص لکھ دیئے۔ چند روز بعد جنرل صاحب نے جی ایچ کیو میں مجھے طلب فرمایا اور کہا۔

''یہ کچن ہے بو وو والا تو معمولی بات ہے' لیکن یہ تم نے کیا لکھ دیا کہ غسل خانے میں لگا ہوا شاور پانی Shower نہیں کرتا صرف Sprinkle کرتا ہے' سیدھا سیدھا بتاؤ کہ پانی آتا ہے یا نہیں آتا ہے۔''

عرض کیا ''سر' پانی تو آتا ہے مگر تھوڑا تھوڑا''

فرمایا ''کوئی بات نہیں ہم سب بنگلوں میں ٹونٹی بڑا لگوا دے گا''

میرے بیٹھے ہی ان کی لاہور بک کرائی ہوئی کال آ گئی۔ انہوں نے پوچھا کمانڈر انجینئر (بریگیڈیر) ہیں۔ جواب نفی میں ملا۔ سی او (لیفٹیننٹ کرنل) ہے؟ پھر جواب نفی میں ملا'' میجر صاحب'' ''جی وہ بھی سائٹ پر گئے ہوئے ہیں'' '' ہے کون؟'' جی ایک اوورسیئر ہے''۔ اچھا اس سے بات کراؤ'' اس سے بات صرف یہ کی کہ ہم نے نئے مکانوں کے دروازوں کے لئے جو تالے بھجوائے تھے' وہ دائیں جانب مروڑنے سے کھلتے ہیں یا بائیں جانب؟''

اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں تھا۔ جنرل صاحب نے کہا۔ ''اچھا جب بریگیڈیر صاحب آتے ہیں تو انہیں بولو کہ چیک اپ کر کے مجھے رپورٹ کریں۔''

یہ تھا ان کے کام کرنے کا انداز۔ انہوں نے اپنی محنت اور دیانت داری سے فوج میں بہت عزت کمائی (اور کہیں اور گنوائی)

بنگلہ ملنے سے مال ہوسٹل کی ساری محفلیں اور رونقیں پشاور روڈ کے مغربی جانب پر واقع اس چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گئیں۔ یہاں آ کر صرف ایک نقصان ہوا' وہ یہ کہ مال ہوسٹل میں مہمانوں کی اچانک آمد پر مستعد اردلی چور دروازے سے نکل کر جس پھرتی اور

رازداری سے سموسے اور چاٹ وغیرہ بازار سے لے آتا تھا' اب ممکن نہ رہا تھا۔ اب تو گھر میں بسکٹ یا بیسن موجود ہے تو عیش کر لیجئے ورنہ خالی چائے پر شعروں کی داد دیجئے (یہ شعر میرے نہیں ہوتے تھے)

اردلی کے ذکر سے یاد آیا کے نئے بنگلے میں پہنچتے ہی مجھے ایک نیا اردلی ملا جو بیوی سے بھی زیادہ سگھڑ اور سلیقہ شعار تھا' وہ میری وردی تیار کرنے اور بوٹ چمکانے کے علاوہ گھر کا چھوٹا موٹا کام بھی کر لیتا تھا۔ سردیوں میں کوئلوں کی انگیٹھی پچھلے دالان میں پھونکیں مار مار کر جلاتا تھا اور جب کوئلے دہک جاتے تھے تو کمرے کے اندر لے آتا تھا۔ گرمیوں میں پنکھے کی پرواہ کئے بغیر آرام سے کوارٹر میں سو جاتا تھا' لیکن میرے پنکھے کو بے آواز رکھنے کے لئے خود چارپائی پر کھڑا ہو کر گریس لگا دیتا تھا۔ اس کی خدمت کا انداز لاجواب تھا۔

ایک دن پانچ چھ مہمان رات کو بے وقت آوارد ہوئے۔ گھر میں کچھ بچا ہوا سالن اور گوندھا ہوا آٹا موجود تھا۔ میں نے بیوی کو کچن میں لانچ کیا اور اردلی کو اپنی ذاتی برق رفتار سائیکل دیتے ہوئے کہا۔

''احمد خان ذرا پھرتی دکھاؤ۔ یہ میری سائیکل لے جاؤ۔ بازار سے نان' کباب اور فروٹ لے آؤ''

''وہ اچھا صاب'' کہہ کر غائب ہو گیا۔ میں نے مہمانوں کو باتوں میں لگائے رکھا تاکہ بیوی چپاتیاں پکا لے اور اردلی بازار سے کمک لے آئے۔ روٹیاں پک گئیں۔ سالن گرم ہو گیا۔ باتیں ختم ہو گئیں۔ مہمان بیتاب ہو گئے' میں بیقرار ہو گیا لیکن احمد خان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ ہم نے مجبوراً ماحضر پر حملہ کر دیا' جو کچھ دستیاب تھا' فوراً چٹ کر گئے' آخری لقمے کے وقت میری نظر بار بار گیٹ کی طرف اٹھتی تھی اور کان سائیکل کی گھنٹی کے منتظر تھے کہ شائد کمک بروقت پہنچ جائے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ ہم یوں ہی نیم سیر شکم ٹوتھ پک لے کر لان میں ٹہلنے لگے' بیوی چائے بنانے لگی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ احمد خان ایک ہاتھ میں سامان اٹھائے دوسرے ہاتھ سے سائیکل گھسیٹتے ہوئے آ رہا ہے۔

میں نے کہا۔ ''احمد خان اتنی دیر کر دی؟''

اس نے معصومیت سے کہا۔

''سر! سائیکل بھی تو تھی''

''سائیکل کا دیر سے کیا تعلق؟''

''جی سائیکل چلانا نہیں آتی''

''تو لے کیوں گئے؟

''جی' آپ نے کہا تھا کہ سائیکل بھی لے جاؤ''

''لاحول ولاقوۃ..........''

اس بنگلے کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس کے سامنے لان کی جگہ خالی پڑی تھی' میں نے قریبی یونٹ سے ورکنگ پارٹی منگوا کر اسے خوب تیار کروایا۔ دفتر کے مالی کو ٹپ دے کر اس میں امریکی گھاس لگوائی اور اپنے پورے خاندان کو اس کی آبیاری پر متعین کیا' چار سالہ صحیفہ اور دو سالہ سرمد پائپ گھسیٹ گھسیٹ کر اس کو پانی دیتے اور خود بھی اس میں شرابور ہو جاتے۔ ہم سب کی محنت کے طفیل یہ لان چند مہینوں میں لش گرین ہو گیا۔ صبح کو شبنم آلود گھاس پر چہل قدمی کر کے بڑا مزا آتا تھا۔ پاؤں رکھتے تھے تو پاؤں تازہ ہو جاتے تھے' نگاہ ڈالتے تھے تو نظر تازہ دم ہو جاتی تھی۔

ہمارے پڑوس میں ان دنوں ایک ناک چڑھی لیڈی ڈاکٹر رہتی تھی جو مجھ سے سینئر اور میری بیوی سے خوبصورت ہونے کی وجہ سے خاصی اکڑی اکڑی رہتی تھی۔ ہم نے بھی غالب کا مصرع اپنا رکھا تھا کہ

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

گرمیوں کی ایک صبح کو معمول سے ذرا قبل میری آنکھ کھلی تو حسب معمول پہلی نظر لان پر ڈالی' کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹرنی صاحبہ ننگے پاؤں اور ننگے سر ہمارے شبنم آلود لان پر مٹر گشت کر رہی ہیں۔ میں نے اوپر والے بیڈ روم کی کھڑکی سے انہیں پہلی مرتبہ جی بھر کر دیکھا۔ اس کی حرکت دیکھ کر غصہ آ رہا تھا اور اس کا حسن خاص کو سفید پاؤں دیکھ کر رشک آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شبنم کے موتی تو پھر رات کو اتر آئیں گے۔ یہ حسن ہمارے لان میں کب روز روز اترے گا۔ میں نے اس کا قصور معاف کر دیا اس کا یہی تجاوز ہمارے تعارف کا سبب بن گیا۔

چند روز بعد' میں اچھی خاصی باغبانی کرتا' ٹینس کھیلتا اور زقندیں بھرتا اچانک بیمار پڑ گیا۔ ہسپتال گیا تو انہوں نے لٹا لیا۔ فرمایا Kidney Infection ہے۔ چند روز ہسپتال میں قیام کرنا ہوگا' چنانچہ میں سی ایم ایچ راولپنڈی کے کمرہ نمبرے میں جمع ہو گیا' جہاں مجھ جیسے تین اور کپتان جمع تھے' دو دن تو تفتیش اور تشخیص میں لگ گئے اور تیسرے دن علاج کی نوبت آئی۔ انہوں نے مجھے بستر پر چت لٹا کر ڈرپ (Drip) لگا دی' ڈراپ کا منظر تو آپ کو یاد ہوگا خواہ مخواہ مریض کی روح کے لئے مغفرت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس حالت میں میری بیوی اپنی پڑوسن ڈاکٹرنی کے ساتھ میری مزاج پرسی کو پہنچ گئیں۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ دونوں اپنی اپنی بساط

کے مطابق پریشان ہوئیں، بیوی غیرڈاکٹر تھی زیادہ گھبرائی۔ پڑوسن دوادارو کے علاوہ دوسرے اسرار و رموز سے بھی واقف تھی۔ اس لئے فوراً سمجھ گئی۔ اس نے مجھے اور میری بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا اس بوتل میں نمکین پانی (Saline Water) ہے جو جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہے۔ میں نے عرض کیا۔ ''اگر میں ایسا ہی نمکین پانی مطلوبہ مقدار میں پی لوں تو کیا اس خوفناک ڈھانچے سے نجات مل سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں نہیں۔'' چنانچہ اس کے کہنے پر دیکھتے ہی دیکھتے یہ سارا ڈرامہ سمیٹ لیا گیا اور نمک سے بھری نمکدانی' ایک چھوٹا چمچہ اور فرج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل مجھے ''اشو'' کر دی گئی اور کہا گیا کہ اگر رات کو نمک کی مناسب مقدار کے ساتھ پانی کی بوتل ختم کرلو' تو صبح یورین ٹیسٹ کر لئے چلے جانا۔ بس تین چار دن یہی عمل دہرانا ہوگا اور یورین رپورٹ نارمل ہوئی تو آپ کو چھٹی مل جائیگی۔

میں نے ساری رات اس نسخے پر عمل کیا' پانی کی بوتل ختم ہوگئی تو ریفریجریٹر سے اور نکال لایا۔ نمک گھول گھول کر پانی پیتا اور کڈنی فلش کرتا رہا۔ صبح یورین ٹیسٹ کے لئے لیبارٹری گیا اور واپس آیا تو نمکدانی اور چمچہ غائب۔ نرس سے پوچھا۔ ''یہ سامان صحت کہاں گیا'' اس نے جواب دیا۔ آپ کو یہ چیزیں Authorize نہیں ہیں۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر ہم نے نمکدانی اور چمچہ ساتھ والے وی آئی وارڈ سے لا دیا تھا' اب واپس کر دیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کاغذ میں نمک کی پڑیا بنا کر لاسکتی ہوں۔''

میں ہسپتال میں کوئی ہفتہ بھر رہا' دوست احباب آتے اور جاتے رہے۔ اور جو باتکلف تھے' وہ آ کر یہ سارا مال چٹ کر جاتے۔ جب ملاقاتی چلے جاتے اور ڈاکٹر اپنی من پسند نرس کو ساتھ لے کر راؤنڈ پر آتے' تو میرے بستر کے پاس پڑی ہوئی ردی کی ٹوکری کو لبا لب بھرا دیکھ کر میرے چہرے کی طرف دیکھتے اور کہتے کہ ماشاء اللہ صحت پانی کی رفتار خاصی تیز ہے۔

جب ملاقاتی' ڈاکٹر اور نرسیں سب اپنے اپنے آشیانوں میں چلے جاتے تو ہم چار کپتان....... چار یاری کے ماحول میں .... خوب گپ لگاتے نرسوں اور ڈاکٹروں خاص کر لیڈی ڈاکٹروں پر تبصرے کرتے اور ان کی نجی اور روحانی زندگی کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے مثلاً ایک چڑ چڑی طبیعت کی خاتون ڈاکٹر کے متعلق ہمارا متفقہ فیصلہ تھا کہ اس کا خاوند ہونا زندگی کا مشکل ترین کام ہوگا۔ ایک پابندی وقت کے قائل مرد ڈاکٹر کے متعلق ہماری قیاس آرائی تھی کہ یہ شخص جو روزانہ ٹھیک تین بج کر ۵۴ منٹ پر آتا ہے' کبھی کسی حسینہ کے ساتھ ڈیٹنگ (Dating) نہیں کر سکتا کیوں کہ جونہی وہ بیچاری ایک منٹ لیٹ ہوئی' اس نے Appointment کینسل کر دی' بھلا اتنی پابندی وقت کے ساتھ بھی کبھی گلشن کا کاروبار چل سکتا ہے۔

ڈاکٹروں کے علاوہ ہسپتال بھی ہمارے زیر بحث آتے رہے' میرے کمرے کے سینئر مریضوں نے (تھے وہ بھی کیپٹن) مجھے بتایا

کہ ایک مرتبہ ایک مریض دانت نکلوانے کے لئے داخل ہوا۔ ایک شخص آیا۔ اس نے دائیں جبڑے کے چوتھے دانت کو سن کیا' ڈاکٹر آیا اس نے بائیں جبڑے کا چوتھا دانت کھینچ باہر نکالا۔ دوسرے کپتان نے لقمہ دیا' یہ تو معمولی بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک ایسی ہی غلط فہمی میں ایک مرتبہ پیٹ درد والے کے دماغ کا آپریشن ہو گیا اور آپریشن والا مریض آپریشن کے بغیر ہی مر گیا۔ میں نے کہا ''دوستو! میں چلتا ہوں' معمولی سی انفیکشن تھی' کہیں دوا کراتے کراتے گردے' دانت یا پھیپھڑے سے محروم نہ ہو جاؤں۔'' انہوں نے کہا۔ ''فکر مت کرو'' یہ لطیفے فوجی ہسپتالوں کے متعلق نہیں ہیں۔'' میں پھر بھی حفظ ما تقدم کے طور پر ساتویں دن گھر چلا آیا۔

''پڑوسن لیڈی ڈاکٹر کا کیا ہوا؟'' ایسے سوال پوچھنا آداب شرافت کے منافی ہے۔

◆◆◆

جنرل یحییٰ کا مارشل لاء

میں ہسپتال سے صحت یاب ہو کر آیا' تو ملک بیمار پڑ چکا تھا' اسے اقتصادی ترقی اور سیاسی قحط کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا' فیلڈ مارشل ایوب خان اپنے مشیروں کے کہنے پر عشرہ ترقی وخوشحالی منا رہے تھے اور عوام ٹیلی وژن اور اخبارات میں ترقیاتی گراف دیکھ دیکھ کر پوچھ رہے تھے کہ اس خوشحالی وفراوانی میں ہمارا حصہ کہاں ہے۔ جس غبارے میں پچھلے دس سال سے خودستائی اور خودفریبی کی ہوا بھری جا رہی تھی اب پھٹنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فروری/ مارچ ۱۹۶۹ء پاکستان میں شدید احتجاج اور گھیراؤ جلاؤ کے مہینے تھے۔ صدر مملکت اپوزیشن سے مذاکرات پر رضامند ہو گئے تھے اور نیتجتاً گول میز کانفرنس منعقد ہوگئی تھی لیکن مشرقی پاکستان سے مولانا عبد الحمید خاں بھاشانی اور مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو اس کانفرنس کو گول کر گئے تھے۔ وہ مذاکرات کی میز پر آنے کی بجائے بالترتیب گھیراؤ جلاؤ اور جلسے جلوسوں کو ترجیح دیتے تھے۔

میں اور مجھ جیسے دیگر جونیئر افسران سیاسی نشیب وفراز سے دور اپنے اپنے کام میں مگن تھے۔ میں ہسپتال سے نکلا تو جگہ جگہ کسی آنے والی تبدیلی کی بو محسوس ہوئی' کسی نے کہا۔ فیلڈ مارشل جانے والے ہیں' کسی نے لقمہ دیا اپوزیشن آوے ہی آوے' ایک سنکی سے اخبار نویس نے سرگوشی کے لہجے میں بتایا ''فیلڈ مارشل کے بعد کوئی جنرل ہی آیگا'' میں نے اپنا منہ بند رکھا۔

میں دفتر گیا تو ان سرگوشیوں میں اس سرگوشی کا اضافہ ہوا کہ جنرل یحییٰ خان کی طرف سے جنرل گل حسن بڑا کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں' میں نے اسے بھی سنی ان سنی کر دی کیونکہ حال ہی میں تو فوجی تربیت کے دوران سیکھ کر آیا تھا کہ اچھے فوجی سیاست سے دور رہتے ہیں۔

بال آخر ۲۵ مارچ ۶۹ء کی شام کو بلی تھیلے سے باہر آ گئی اور صدر مملکت ایک عدد الوداعی نشری تقریر کر کے اقتدار سے دستبردار ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے ہی تعینات کردہ کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحییٰ خان کو چھٹی لکھ دی کہ آپ اپنی ''آئینی ذمہ داریاں'' پوری کریں۔ سچ پوچھیے تو اس وقت مجھے ہرگز علم نہ تھا کہ ایسی صورت حال میں فوج کی آئینی ذمہ داری کیا ہوتی ہے کیوں کہ آئین میں تو لکھا تھا کہ ایسی صورت میں اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کو منتقل کیا جائے گا۔

اسی شام ڈائریکٹر صاحب نے مجھے بلوا کر فوج کی اس ''آئینی ذمہ داری'' کے سلسلے میں مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ شام کو میں ریڈیو

پاکستان کی ریکارڈنگ ٹیم لے کر جی ایچ کیو پہنچ جاؤں' وہ شام خاصی طوفانی تھی' تیز بارش اور تیز تر آندھی میں ریڈیو ٹیم کو ریڈیو اسٹیشن سے جیپ میں بٹھا کر جی ایچ کیو کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں موسلا دھار اور ترچھی بارش نے جیپ کی ترپال کو خوب پیٹا' کئی بار چھینٹے اندر مجھ پر اور ریڈیو ٹیم پر بھی پڑے' ریڈیو والے بیچارے اپنا ٹیپ ریکارڈر بچا بچا کر رکھ رہے تھے کہ ابھی اس میں ملک کے نئے سربراہ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی تقریر ریکارڈ کرنی ہے۔ بارش تھی کہ انہیں اس کام سے باز رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی' میرا ووٹ بارش کے ساتھ تھا لیکن حکم عدولی کی جرات بھی نہ تھی۔ چنانچہ ہم بھیگتے بھاگتے بارش کے تھپیڑے کھاتے جی ایچ کیو کے گیٹ پر پہنچ گئے' خاصی سخت تلاشی لی گئی برساتی پوش سنتری نے ٹارچ لگا کر سویلین سواریوں کا جائزہ لیا۔ میری وردی کو پاسپورٹ جانا اور ہمیں اندر جانے دیا۔ لیکن جنرل یحییٰ خان کے دفتر کے باہر ملٹری پولیس والوں نے ہمیں روک لیا۔ ان کے سیکریٹریٹ کے برآمدے کی چھت ڈھلوان تھی اور اس پر پرانی وضع کی سرخ اینٹیں لگی تھیں۔ سامنے ٹین کا چھجا تھا' جس پر سبز پینٹ لگا ہوا تھا۔ ہم وہیں بارش میں کھڑے سرخ اینٹوں اور سبز چھجے پر غصیلی بارش کا نظارہ کرتے رہے حتیٰ کہ اندر سے اجازت نامہ آ گیا اور ہمیں ایک کر کے اے ڈی سی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

اندر کا ماحول خاصا گرم تھا جسے ٹھنڈا کرنے کے لئے شراب کی بوتلوں کے کریٹ برف میں لگے ہوئے تھے' دو تین مستعد ویٹر بڑے لوگوں کی دل پسند شراب اے ڈی سی کے کمرے سے اندر' صاحب اور ان کے مصاحب کے پاس لے جا رہے تھے' اتنے میں اے ڈی سی اپنی سیٹ چھوڑ کر اندر یہ بتانے کے لئے گیا کہ ریڈیو ٹیم پہنچ گئی ہے۔ میں بھی اے ڈی سی کے پیچھے پیچھے چیف صاحب کے دروازے تک گیا اور دروازے کے گول سوراخ سے اندر جھانکا تو جنرل یحییٰ خان اپنی کرسی پر بیٹھے چہک رہے تھے' ان کے سامنے دو تین سویلین بیٹھے تھے' جن میں انفارمیشن سکریٹری الطاف گوہر بڑے نمایاں تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ وہی دام جو فیلڈ مارشل کو اس انجام تک پہنچا چکے ہیں اب جنرل یحییٰ خان کے گرد بھی بچھائے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کی گفتگو یا اس کا موضوع معلوم نہ ہو سکا لیکن ان کے چہروں کی چمک دمک اور ٹھنڈی ٹھنڈی شراب نے جو سماں باندھ رکھا تھا' وہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

جنرل یحییٰ خان نے شراب پی کر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باشندوں کے نام اپنی تقریر ریکارڈ کرائی' تقریر انگریزی میں تھی۔ تقریر میں باقی مسالہ تو وہی تھا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے لیکن ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء میں کہا گیا تھا کہ ملک کو دوبار Keel پر رکھنے کے لیے مارشل لاء لگایا گیا ہے کہ ملک پٹڑی سے اتر گیا اور اسے دوبارہ ''To Put it Back on the Rails'' کی خاطر مارشل لاء کو زحمت دی گئی ہے' دس سال میں صرف ''کیل'' اور ''ریل'' کا فرق پڑا تھا۔

تقریر کی احتیاطاً دو کاپیاں تیار کی گئیں' ان دنوں نیشنل ہک اپ کی سہولت صرف کراچی میں میسر تھی۔ چنانچہ ایک کیسٹ ریڈیو والوں کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ کل شام (۲۵ مارچ) کو قومی رابطے پر نشر کرنے کا اہتمام کریں اور دوسرا کیسٹ بریگیڈیئر بچو کریم کو دیا گیا کہ وہ اسے کراچی لے جائیں تاکہ اگر کوئی اس مشن کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرے تو دوسرا کیسٹ استعمال ہو سکے۔

یوں برستی بارش میں شراب سے شرابور ہو کر کمانڈر انچیف نے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کر دیں اور میں نے مارشل لاء لگنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اگلے روز تقریر نشر ہو گئی اور ملک دوسری بار مارشل لاء کے آکسیجن ٹینٹ میں داخل ہو گیا۔

برسر اقتدار آنے کے بعد یوں تو جنرل یحییٰ خان نے اور بھی بہت سے کارنامے انجام دیئے لیکن ایک واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ ان دنوں لیفٹیننٹ جنرل ایس اے میاں ڈائریکٹر میڈیکل سروسز تھے' وہ انہیں سی ایم ایچ راولپنڈی لے گئے۔ اس دورے میں ہسپتال کے کمانڈنٹ ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ پہلے وہ جے سی او وارڈ میں گئے۔ جہاں تمام مریض بڑے سلیقے اور ترتیب کے ساتھ سرخ کمبلوں میں لپٹے اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ وارڈ کا فرش دھلا ہوا تھا اور اس میں سے فینائل اور آئیوڈین کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ جنرل یحییٰ خان وارڈ میں داخل ہوئے۔ جنرل میاں اور کمانڈنٹ ان کے پیچھے پیچھے' وارڈ کا انچارج ڈاکٹر اور سفید وردی میں ملبوس میٹرن پہلو بہ پہلو' چلتے چلتے جنرل یحییٰ ایک بیڈ کے پاس رکے جہاں ان کا ایک پرانا ساتھی نائب صوبیدار نواز گل لیٹا ہوا تھا' ہٹا کٹا' سرخ و سپید' اس کا تروتازہ چہرہ دیکھ کر جنرل یحییٰ خان نے پوچھا۔ ''گل' کیا ہوا۔'' اس نے دائیں ہاتھ کا پٹی بندھا ہوا انگوٹھا اوپر اٹھایا اور کہا۔ ''سر! ناخن میں پیپ پڑ گئی ہے۔'' ''شرم کرو نواز گل' شرم کرو' کیا انگوٹھا لے کر ہسپتال میں لیٹ گئے' اٹھو' وہ فوراً اٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ ''میں تو صرف پٹی کروانے آیا تھا لیکن آپ کی آمد پر انہوں نے مجھے زبردستی یہاں لٹا دیا' کہتے تھے خالی بیڈ برا لگتا ہے۔''

اس کے بعد جنرل میاں انہیں آفیسرز وارڈ میں لے گئے۔ وہاں کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا۔ اس کے بعد نو تعمیر شدہ وی آئی پی وارڈ کا معائنہ کرتے ہوئے اس کے Terrace پر پہنچ گئے۔ جہاں صبح کی روپہلی دھوپ میں چائے چنی ہوئی تھی' جنرل میاں یہ اہتمام انہیں وہاں لے گئے تھے کیوں کہ وہاں سے بائیس نمبر چونگی اور اس کا ملحقہ علاقہ با آسانی دکھائی دیتا تھا' آج بھی وہاں بسیں' ویگنیں اور تانگے کھڑے تھے اور قریب ہی گوبر میں لت پت بھینسیں جگالی کر رہی تھیں۔ جنرل میاں نے جنرل یحییٰ خان کو چکن سینڈوچ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''سر' یہ ساتھ والا علاقہ خاصا Unhygienic ہے' ہم پچھلے کئی سال سے اسے خالی کرانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن Bloody Civilians اسے خالی ہی نہیں کرتے۔ اب ماشاءاللہ آپ All in All ہیں' یہ بھینسیں تو یہاں سے ہٹوا دیں''

جنرل یحییٰ خان نے ترت جواب دیا۔

Mian! Dont't Forget that it is Easier to remove a General than a buffalo forget about it.

(جنرل میاں' یہ مت بھولو کہ ایک بھینس کی نسبت ایک جنرل کو ہٹانا آسان ہے' بھول جاؤ اس قضیئے کو)

جنرل یحییٰ خان جو بھینسوں کے متعلق اپنے آپ کو بے بس سمجھ رہے تھے' ساری سول بیوروکریسی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے لگے' دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ۳۰۳ سنیئر سول ملازمین کو برخاست کر دیا' جن میں میرے سابق باس سید قاسم رضوی بھی تھے۔ (سنا ہے وہ بعد میں اسی غم میں اس دار فانی سے انتقال کر گئے)

جنرل یحییٰ خان نے پریذیڈنٹ ہاؤس میں اپنا نیا دفتر بنایا اور فیلڈ مارشل ایوب خان والے گھر میں سکونت اختیار کی' ہمارے نئے ڈائریکٹر بریگیڈیئر ایف آر صدیقی پی آر کی طرف سے جز وقتی بنیاد پر اس ہیڈکوارٹر سے منسلک ہو گئے' ہم پیچھے آئی ایس پی آر میں ان کی فل سپورٹ میں مصروف عمل رہے' وہاں سی ایم ایل اے ہیڈکوارٹر میں کبھی کبھی جانے کا اتفاق ہوتا' وہاں اصل حکمرانی جنرل یحییٰ خان کے پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم ایم پیرزادہ کی تھی جو سرکاری فائلوں سے نپٹتے اور امور مملکت کو نمٹاتے تھے' وہ معمول کے امور کو تو خود ہی بھگتا دیتے تھے لیکن اہم قومی معاملات پر جنرل یحییٰ خان سے فیصلے لے لیتے تھے۔ میں نے بہت کم جنرل یحییٰ خان کو دفتر میں بیٹھے' فائلوں سے الجھتے دیکھا۔ وہ سٹافیے نہیں کمانڈر ٹائپ مشہور تھے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ سٹافیہ آفسر فائل پڑھنے' اس کا تجزیہ کرنے' اور نوٹ لکھنے اور PUC(Paper Undr Considerration) لگانے میں مہارت رکھتا ہے جبکہ کمانڈر Stick اٹھائے آتا ہے' مسئلہ سنتا ہے' موقعے پر ہی فیصلہ دیتا ہے اور آگے نکل جاتا ہے۔

قارئین محترم! اگر آپ تھوڑا سا تعاون کریں تو یہاں بے ضرر سا فلسفہ جھاڑ لوں۔ وہ یہ کہ عموماً فوج میں جو لوگ بلندترین چوٹی پر پہنچتے ہیں' وہ سٹافیے کم اور کمانڈر زیادہ ہوتے ہیں۔ ان کا کام کاغذوں سے کھیلنا نہیں ہر وقت فیصلے دینا ہوتا ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لا کر فوج میں بڑے مئوثر اور کامیاب سپہ سالار ثابت ہوتے ہیں لیکن جب انہیں' برضا و رغبت یا بہ امر مجبوری' امور مملکت سنبھالنا پڑ جائیں تو ان کا یہ طریقہ کار بڑا مہلک ثابت ہوتا ہے کیوں کہ ان کے فیصلے کسی یونٹ کو اضافی راشن یا کسی سپاہی کو ایک جوڑا بوٹ اشو کرنے تک محدود نہیں ہوتے' بلکہ ان میں بعض ایسے فیصلے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر ملک کی بقا اور سلامتی پر پڑتا ہے۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ غلط سیاسی فیصلے ٹی بی کی طرح ہوتے ہیں جو شروع میں قابلعلاج مگر ناقابل شناخت ہوتے ہیں لیکن بعد میں ان کے اثرات واضح نظر آتے ہیں لیکن اس وقت وہ لاعلاج ہو چکے ہوتے ہیں۔

جنرل یحییٰ خان نے اپنے دور اقتدار میں کچھ ایسے ہی کمانڈر ٹائپ فیصلے کئے جن کے نتائج پوری قوم نے بھگتے مثلاً ''ون مین ون ووٹ'' کا اصول اپنا کر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان پر دائمی برتری دے دی' ون یونٹ کو توڑ کر مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو لخت لخت کر دیا لیکن ملک کی پارلیمنٹ کی دو ایوانوں کی بجائے ایک ایوان تک ہی محدود رکھا۔ ایک سیاستدان کو خوش کرنے کے لئے ایک فیصلہ دے دیا اور جب دوسرے کی طرف سے دباؤ پڑا تو اس سے معاملہ طے کر لیا وغیرہ۔

میرا یہ عقیدہ ہے کہ اچھا کمانڈر لازماً اچھا سیاستدان اور اچھا سربراہ مملکت ثابت نہیں ہوتا' کیوں کہ دونوں کاموں کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں' دونوں زندگی بھر کی ٹریننگ مانگتے ہیں' جس کے نتیجے میں دونوں کے Reflexes الگ الگ تشکیل پاتے ہیں۔

ہمارے اکثر مصائب غلط Perceptions اور غلط Reflexes کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

فلسفہ ختم ہوا' آیئے اب آپ کو مشرقی پاکستان لئے چلتے ہیں' لیکن وہاں جانے سے پہلے راولپنڈی کی تین شخصیات کی ایک ایک جھلک!!

◆◆◆

ایوب، یحییٰ، اسحاق

نومبر ۱۹۶۹ء میں میری کپتان کے دن تھوڑے تھے کیونکہ میں میجری کیلئے عدت یعنی کم از کم مدت ملازمت پوری کر چکا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میرے خیر خواہ ترقی کا لالچ دے کر مجھے ڈھاکہ بھیج دیں گے۔ ڈھاکہ جانے سے پہلے میں نے قیام راولپنڈی کے دوران اپنے سینئر افسروں پر نظر ڈالی تو تین پیغمبری نام سامنے آئے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان، جنرل یحییٰ اور ان کے پرائیوٹ سیکرٹری (بعد میں ملٹری سیکرٹری) میجر جنرل محمد اسحاق خان! سوچا ڈھاکہ جانے سے پہلے ان تین ہستیوں کے بارے میں اپنے تاثرات میں آپ کو شریک کر لوں۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں

میں نے انہیں پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں دیکھا جب وہ جنرل تھے اور میں لاہور میں طالب علم تھا۔ ان دنوں مجھ پر ایم۔ اے (انگلش کرنے کا جنون سوار تھا، اس لئے مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ ملکی حالات کدھر جا رہے ہیں اور صدر سکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خاں انہیں کدھر لے جانا چاہتے ہیں، میں اپنے ہوسٹل کے سامنے گول باغ (لاہور) میں پاجامہ قمیض پہنے شیکسپیر اور ملٹن سے دو دو ہاتھ کر رہا تھا کہ اتنے میں بچوں نے شور مچا دیا کہ جنرل ایوب رہے ہیں۔ اتنا شور تو مارشل لاء لگنے پر پوری قوم نے نہیں مچایا تھا۔ بہر حال ہم اپنی کتابیں سمیٹ اور کپڑے جھاڑ کر فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹر سائیکل سوار آیا اور ہوٹر بجاتا ہوا آگے نکل آیا۔ پھر ملٹری پولیس کی جیپ گزری اور اسکے پیچھے کھلی کار میں جنرل ایوب خاں، وہ وردی پہنے ہوئے تھے اور اپنے سرخ و سپید چہرے کے ساتھ، ہاتھ ہلا ہلا کر اپنی رعایا کے سلام کا جواب دے رہے تھے،

میں نے انہیں آخری مرتبہ ۱۹۶۹ء کے اوائل میں دیکھا جب وہ ایک غیر ملکی مہمان کو الوداع کہنے اسلام آباد ائر پورٹ پر آئے تھے، اس وقت ان پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور ان کا اقتدار مفلوج ہو چکا تھا، اب انہوں نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا لیکن ان کا جسم سوکھ چکا تھا، وہ کھلے کھلے سوٹ میں سوکھے سوکھے یوں لگ رہے تھے جیسے اقتدار کے کھیت میں Scare Crow رہی سہی کسر تارمک پر پڑے سرخ قالین نے پوری کر دی، جونہی مہمان گرامی جہاز میں سوار تارمک پر پڑے سرخ قالین نے پوری کر دی، جونہی

مہمان گرامی جہاز میں سوار ہوئے اور فیلڈ مارشل ایوب خان اور ان کے ساتھی ہوا میں الوداعی ہاتھ لہرانے کے لئے پیچھے ہٹے تو وی آئی پی جہاز کے بیک بلاسٹ (Back Blast) سے لمبا چوڑا قالین اڑ گیا' ساری خاک اڑ کر فیلڈ مارشل کے منہ پر پڑی' ان کے ساتھیوں نے منہ چھپا لیا' ان کا منہ خاک آلود ہو گیا۔

ان دو مشاہدات کے درمیانی عرصے میں مجھے کچھ عرصہ وفاقی وزارت اطلاعات و نشریات میں بھی گزارنے کا موقع ملا جب فیلڈ مرشل ایوب خاں کے اقتدار و مشریات میں بھی گزارنے کا موقع ملا جب فیلڈ مارشل ایوب خاں کے اقتدار کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا' یہ ۱۹۶۳۔ ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب وہ مارشل لاء کا ڈنڈا چھوڑ کر جمہوریت کی چھڑی سنبھال چکے تھے اور وزارت مذکورہ کو فعال بنانے کیلئے الطاف گوہر اور سید قاسم رضوی کو لائے تھے۔ مجھے رضوی صاحب کے ایک ادنیٰ نائب کے طور پر وہاں کام کرنے کا اتفاق ہوا۔

میرا کام مقامی اور غیر ملکی پریس کو کھنگالنا اور اہم نکات سے افسران بالا کو مطلع کرنا تھا' اس کے علاوہ سرکاری پالیسی کی حمایت میں مضامین لکھنا اور اخبارات میں چھپوانا بھی میرے فرائض میں شامل تھا' لیکن میرا خیال ہے کہ افسران بالا کی نظر میں میری اصل افادیت یہ تھی کہ میں کوئی ضروری فائل لے کر دستی طور پر فیلڈ مارشل ایوب خاں یا (دفتری اوقات میں) ان کے سیکرٹری کو پہنچا آؤں۔ یہ کام تو دراصل ایک چپراسی یا ڈی۔آر (Desparch Rider) کا تھا لیکن جب وہ بڑی سے کار دے کر مجھے سیکرٹ یا ٹاپ سیکرٹ فائل تھماتے تو میں بڑا امپارٹنٹ محسوس کرتا ایک دفعہ شام کو میں پریذیڈنٹ ہاؤس میں فائل دینے گیا تو وہ پتلون بش شرٹ پہنے لان میں بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک ملازم میری طرف فائل لینے کو بڑھا' اتنے میں صدر صاحب نے مجھے دیکھ لیا' انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا' میں ان کے پاس گیا' فائل ان کے ہاتھ میں تھمائی اور واپس آ گیا انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا نہ بات' مگر پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑا ہوں جو قومی امور کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ان فائلوں سے بھی ہو رہا تھا جنہیں وہ نہایت دقت نظر سے پڑھ رہے تھے۔

میرے اس تاثر کی تصدیق چند مہینے بعد ایک فائل کے ذریعے بھی ہو گئی وہ یوں کہ جونہی میرے افسران بالا کو میری صلاحیتوں کے متعلق ذرا خوش فہمی ہوئی انہوں نے مجھے پاکستانی سفارت خانوں سے پریس اتاشی اور پریس کونسلرز کی بھیجی ہوئی رپورٹوں کا خلاصہ تیار کرنے کے بعد آخر میں لکھا کہ پاکستان کو مسئلہ کشمیر پر عالمی حمایت کے لیے مختلف ممالک اور مختلف علاقائی خطوں کیلئے مختلف دلائل تیار کرنے چاہئیں کیونکہ ضروری نہیں کہ جو دلائل یورپی ممالک کو قائل کریں وہ افریقی ممالک کے لیے بھی قابل قبول ہوں یا جو

مباحث اسلامی دنیا میں کارگر ہوں اور تیسری دنیا کے ساری ممالک میں موثر ہوں لہٰذا United Support کے لئے ہمیں اپنی سفارتی اسٹریٹیجی پر نظرثانی کرنی چاہیے۔

عموماً میرے ایسے تجزیے میرے اور قاسم رضوی صاحب کے درمیان ہی رہ جاتے تھے اور وہ خود اپنا جامع نوٹ تیار کر کے اوپر بھیجتے تھے اور میرا چیتھڑا مجھے لوٹا دیتے تھے لیکن پتہ نہیں یہ کیوں اور کیسے ہوا کہ انہوں نے میرے تجزیے پر ایک اضافی نوٹ لگایا اور انفارمیشن سیکرٹری الطاف گوہر کو بھیج دیا' انہوں نے اوپر صدر کے پرنسپل سیکرٹری این' اے' فاروقی کو روانہ کر دیا اور فاروقی صاحب نے اسے چھان پھٹک کر صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اب صدر مملکت کی یہ عادت تھی کہ وہ ہر فائل کو شروع سے آخر تک پڑھتے تھے اور جگہ جگہ حاشیے پر سبز روشنائی سے اپنا تبصرہ یا فیصلہ لکھتے جاتے تھے۔ جب میری فائل اس مرحلے سے گزر کر واپس آئی تو میں نے بڑی بیتابی سے دیکھا کہ میرے تجزیئے پر انہوں نے کیا لکھا ہے' ایک جگہ حاشیے پر سوالیہ نشان لگا تھا اور متن میں Untied کے گرد سبز دائرہ لگا ہوا تھا' ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ Untied Support ہے یا United Support میں حیران اس بات پر تھا کہ ٹائپنگ کی جو غلطی قاسم رضوی' الطاف گوہر اور این اے فاروقی کی گرفت سے بچ نکلی فیلڈ مارشل ایوب کی نگاہوں میں آ گئی۔

جنرل یحییٰ خاں

اس لحاظ سے جنرل آغا محمد یحییٰ خاں فیلڈ مارشل ایوب خاں کی ضد تھے' انہیں فائلوں سے گھن آتی تھی' ان کا طرز حکمرانی یہ تھا کہ ان کے حصے کی فائلیں ان کا سٹاف پڑھتا اور اپنی اپنی سطح پر فائلوں کو نپٹاتا جاتا تھا' اگر کوئی فائل ان کی ذاتی توجہ کی محتاج ہوتی تو ان کا پرنسپل سٹاف آفیسر وہ فائل لے کر ان کے حضور پیش ہو جاتا' مختصر سے الفاظ میں فیصلہ طلب بات کا نچوڑ پیش کرتا اور صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان وہیں زبانی کلامی فیصلہ صادر فرما دیتے ''ہاں دیدو'' یا ''مت دو'' اور ان کا پی ایس او (PSO) ان کے فیصلے کے مطابق فائل پر لکھ دیتا کہ صدر مملکت نے منظور یا نامنظور فرما دیا ہے۔ میں نے انہیں کبھی جم کر فائلیں پڑھتے اور نپٹاتے نہیں دیکھا۔

ان کا انداز درحقیقت فیلڈ کمانڈر کا تھا جس کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سٹاف آفیسر کو ساتھ لیکر' ڈنڈا گھماتا ہوا' یونٹ یا فارمیشن میں جاتا اور جوں جوں کوئی مسئلہ اس کے سامنے آتا ہے وہیں موقع پر ہی اس پر فیصلے صادر فرماتا جاتا ہے مثلاً کسی نے کہا

''سر آٹے کی کچھ کمی ہے''

سٹاف آفیسر کی طرف رخ کر کے کہا

''اسے آٹا دیدو''

''سر اس کے لئے ریزروسٹاک کو ریلز کرنا ہوگا''

''کوئی بات نہیں''

اسی طرح کسی نے کہا

''یہاں سڑک کے بغیر بڑی تکلیف ہے۔''

انہوں نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں سڑک بنوادو''

''سر اس کے لئے اضافی بجٹ درکار ہوگا''

''کوئی بات نہیں''

''مگر سر اس کے لیے تو ملک کو دو حصوں میں باٹنا ہوگا۔''

کہتے ہیں کہ اسی رو میں بہتے بہتے وہ ۱۹۷۱ء میں پہنچ گئے انہوں نے پوچھا ''پرابلم کیا ہے''

''سر دو سیاستدان شیخ مجیب اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں بیک وقت وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں۔انہوں نے فرمایا

''بنادو''

''کوئی بات نہیں''

میجر جنرل محمد اسحاق خاں

مزے کی بات یہ ہے کہ جنرل یحییٰ خاں جتنے بلانوش تھے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری میجر جنرل اسحاق اتنے ہی زاہد خشک تھے وہ انہیں جنرل موسیٰ سے ورثے میں ملے تھے اور یہ جنرل اسحاق کا کمال ہے کہ جنرل موسیٰ جنرل یحییٰ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور ذوالفقار علی بھٹو کے پرسنل سٹاف آفیسر رہے۔

میں ان سے پہلی مرتبہ ۱۹۶۴ء میں ملا جب وہ کمانڈر انچیف کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے جسے عموماً PS(C) کہا جاتا ہے میں کپتان تھا اور وہ لیفٹیننٹ کرنل لیکن رعب داب میں وہ رینک کے اس تناسب کو درہم برہم کرجاتے تھے ان سے جنرل بھی ڈرتے تھے اور میں بھی ان کے ٹیلیفون سے بھی خوف کھاتا تھا۔

مجھے پہلی مرتبہ ڈی پی آر نے ایک فائل دیکران کے پاس بھیجا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ وقت پر جانا' فضول بات نہ کرنا اور یہ فائل دے کر چلے آنا۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ یہ فائل ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ان تک پہنچ جانی چاہیے۔

اب میرے ذہن میں پابندی وقت کے بارے میں ایک تصور تو حوالدار رفیق کا دیا ہوا تھا' اب ڈی پی آر نے پابندی وقت کی مزید تاکید کی تو میں ۱۱ بجکر ۲۰ منٹ پر ٹھک ان کے دفتر پہنچ گیا' اس وقت وہ رولر کی مدد سے کسی اہم دستاویز کو سرخ روشنائی سے انڈر لائن کر رہے تھے۔ ان کا روڈا سر فائل پر جھکا ہوا تھا اور اس کی سطح مرتفع کے عین وسط میں ''گنج'' کا ایک چھوٹا سا دھبہ نظر آ رہا تھا جو باقی سر کی نسبت زیادہ چمک دار تھا' انہوں نے میرے سیلوٹ کی ٹھک سن کر سر اوپر اٹھایا اور غصے سے ''ہونہہ'' کہا' میں نے اپنے دفاع میں صرف اتنا کہا۔

''ڈی پی آر''

''کتنے بجے آنے کو کہا تھا؟''

''ساڑھے گیارہ بجے''

''اب کیا بجا ہے؟''

''گیارہ بجکر ۲۱ منٹ''

''نو منٹ پہلے کیوں ڈسٹرب کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔ گیٹ آوٹ''

میں جھاڑ کے جواب میں سیلوٹ کر کے باہر نکل آیا اور اے۔ ڈی' سی کے کمرے میں بیٹھ کر گھڑیاں گننے لگا۔ جب گیارہ بجکر ۲۹ منٹ ہوئے تو میں نے ایک مرتبہ پھر کمر ہمت باندھی' ٹوپی سیدھی کی' زبان ہونٹوں پر پھیری اور ان کے حضور پیش ہو گیا' اب وہ قینچی سے کاغذ کاٹ کاٹ کر فلیگ بنا رہے تھے اور پن کی بجائے سٹیپل مشین سے فائل کے مختلف صفحات پر یوں لگا رہے تھے کہ کوئی فلیگ دوسرے فلیگ پر نہیں آتا تھا بلکہ وہ شانہ بہ شانہ اور صف بہ صف نظر آ رہے تھے۔ بڑی سلیقہ شعاری اور مغز ماری کا کام تھا۔

میں نے ٹھیک گیارہ بجکر ۳۰ منٹ پر ٹھک سے سیلوٹ کر کے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور بڑے ادب سے بند فائل ان کی خدمت میں پیش کی جس طرح پاکستان ملٹری اکیڈمی میں شمشیر اعزاز (Sword of Honour) دونوں ہاتھوں سے پیش کی جاتی ہے۔ انہوں نے میرے سامنے ہی پلاسٹک کی چھری سے لفافے کا پیٹ چاک کیا اور فائل کھول کر اپنے سامنے رکھ لی' اس میں صرف ایک کاغذ لگا تھا جس پر کھلی کھلی چار سطریں پنسل سے لکھی تھیں اور ہر سطر میں بمشکل تین الفاظ تھے گویا پورے صفحے پر کل بارہ الفاظ۔

میں فائل دیکر پلٹنے لگا تو انہوں نے غصے سے کہا

''اپنے ڈی پی آر سے کہو وہ اس طرح سرکاری کاغذ ضائع نہ کیا کریں''

''ٹھیک ہے' سر''

میں باہر نکل آیا اور سوچنے لگا اس بیچارے کو ایک کاغذ کے ضائع ہونے کا کتنا دکھ ہے اگر چند برس اور زندہ رہتا تو ہم اسے بتا دیتے کہ ہانگ کانگ میں سٹیشنری کتنی سستی چھپتی ہے۔

میں دوسری مرتبہ ان کے حضور پیش ہوا تو وہ فون پر کسی بچی سے گفتگو کر رہے تھے (اس وقت تک ان کی اپنی اولاد نہ تھی) میں نے کھڑے کھڑے ان کی حسب ذیل گفتگو سنی۔

''ہاں' بیٹی کتنی سی پارے حفظ کر لئے؟''

''معانی بھی یاد کئے یا نہیں''

''نہ بھئی نا' قرآن پاک معانی کے بغیر یاد کرنے کا مزہ نہیں''

''اچھا یہ بتاؤ۔ امی نے صبح کی نماز پڑھی تھی؟''

''اور ابو نے؟''

''پچھلی مرتبہ کتنے روزے رکھے تھے!''

''نہیں' کوئی بات نہیں' روزے بیشک تم پر فرض نہیں' لیکن شوقیہ رکھو اور جتنے رکھ سکتی ہو رکھو''

''اچھا بیٹا' امی ابو کو سلام کہنا' میں انشاء اللہ اتوار کو آؤنگا''

اتنے کرخت شخص کا اتنا نرم دل! میں تو حیران رہ گیا' جی چاہا کہ اس نرم ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ اظہار خیال کروں مگر ڈی پی آر کی نصیحت یاد آ گئی کہ ان کے سامنے کوئی فضول بات نہ کرنا۔

گفتگو سے فارغ ہو کر مجھ سے پوچھا

''کیسے آنا ہوا''

''ڈی پی آر نے بھیجا ہے' کہہ رہے تھے کوئی ضروری فائل ہے وہ لے آؤ''

''یہ پڑی ہے ہے فائل' لے جاؤ' اور ڈی پی آر سے کہو کہ ایسے چھوٹے موٹے کاموں کیلئے آفیسر Waste نہ کیا کریں''

''یس سر''

میں تیسری مرتبہ کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد ان کے پاس گیا' انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''یہ تازہ ہلال میں مزاحیہ مضمون تمہارا لکھا ہوا ہے''

میں نے کانپتے کانپتے اعتراف جرم کرلیا۔

''اور کل شام ریڈیو پاکستان فورسز پروگرام میں تم تقریر کررہے تھے'' میں نے مزید کانپتے ہوئے مزید اعتراف جرم کرلیا۔

انہوں نے فرمایا۔ ''میں نے مضمون بھی پڑھا ہے' تقریر بھی سنی ہے' دونوں پسند کی ہیں' گڈ۔ ویری گڈ۔۔۔ بیٹھو''

اس کے بعد انہوں نے انسانی سطح پر مجھ سے گفتگو کرنا شروع کی' میری تعلیم اور سابقہ ملازمت کے متعلق تفصیلات معلوم کیں اور ڈی پی آر کے رویے اور موجودہ ملازمت کے بارے میں میری رائے پوچھی' میری قلمی کاوشوں کی حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ کبھی کبھی آجایا کرو اور اگر میں تمہاری کوئی تحریر مس کرجاؤں تو بھجوادیا کرو۔

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ ان کی سخت کھال کے اندر ایک صاف ستھرا' پرہیزگار اور ادب نواز دل محسوس ہوا' پھر میں انہیں جتنا جانتا گیا اتنا ان کا معتقد ہوتا گیا۔ ایسے دیانتدار' مخلص اور اپنے کام کے ماہر لوگ میں نے زندگی میں کم دیکھے ہیں۔

مجھے افسوس کہ وہ ریٹائرمنٹ کے چند ہی سال بعد کینسر کے موذی مرض کے شکار ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

◆◆◆

مشرقی پاکستان: پہلا تاثر

میں جنوری ۱۹۷۰ء میں میجر بن کر مشرقی پاکستان گیا اور دو سال بعد جنگی قیدی بن کر وہاں سے نکلا۔ ان دو برسوں میں میں نے وہاں کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا' خاصی تفصیل کے ساتھ میری الگ کتاب میں درج ہے۔ یہ چند ابواب وہاں کے عمومی تاثر تک محدود ہیں۔

میں نے ڈھاکہ جانے سے پہلے ایک ماہ کی چھٹی کاٹی جس کے دوران چند نجی معاملات نپٹانے کے علاوہ روالپنڈی' لاہور اور کراچی میں احباب سے ملاقاتیں کیں اور ان سے مشرقی پاکستان کے بارے میں تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ایک رجائیت پسند نے فرمایا۔ ''بڑے خوش قسمت ہو' یار' سرکاری خرچ پر اپنے وطن کا خوبصورت ترین اور شاداب ترین علاقہ دیکھنے رجا رہے ہو۔'' دوسرے نے لقمہ دیا۔ ''جی ہاں' واقعی خوش قسمتی کی بات ہے' قبل اس کے کہ اسے ویزا لگوا کر وہاں جانا پڑے۔'' ایک رومان پسند رفیق کار کا کہنا تھا ''بنگالی لڑکیاں بڑی ملاحت بھری ہوتی ہیں اور مغربی پاکستان کی نسبت خاصی بے حجاب بھی'' خود ہی اس نے وضاحت کی کہ ''وہاں کا کلچر ہی ایسا ہے کہ ناچ گانے کے بغیر کوئی گھرانا کلچرڈ نہیں سمجھا جاتا جبکہ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کو کچھ اور کہا جاتا ہے۔'' میں نے عرض کیا ''ہم نے تو پاکستان بناتے وقت یہ دلیل دی تھی کہ مسلمانوں کا کلچر ہندوؤں سے مختلف ہے' آپ بتا رہے ہیں کہ بنگالیوں کا کلچر ہم سے مختلف ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خود ہی وہاں جا کر دیکھ لینا۔''

ایک صحافی جو تازہ تازہ مشرقی پاکستان سے ہو کر آئے تھے' کہنے لگے۔ حال ہی میں ایک فوجی افسر مغربی پاکستان سے وہاں پوسٹ ہوا تو اس نے بنگالیوں کے دل جیتنے کے لئے سب سے پہلے بنگلہ زبان سیکھی' ایک مرتبہ وہ چھاؤنی سے شہر جا رہا تھا کہ کچھ مشتعل بنگالی لونڈوں نے اسے روک لیا اور ''پنجابی شالا' پنجابی شالا'' کی گردان شروع کر دی۔ اس نے ان کی زبان میں اپنی صفائی پیش کرنی چاہی تو انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر گاڑی سے باہر کھینچ لیا اور غصے سے کہا۔ ''ہم پر حکومت کرنے کو ہمارا بھاشا (زبان) بھی سیکھ لیا'' صحافی نے کہا آپ کو یاد ہوگا۔ برصغیر پر حکومت کرنے کے لئے بہت سے انگریز اردو سیکھ لیا کرتے تھے۔

سادہ لوح بیوی سے ڈھاکہ جانے کا ذکر کیا تو اس نے کہا'' ہاں اچھی جگہ ہے' سنا ہے وہاں کی ململ اور کٹ ورک بہت مشہور ہیں۔'' اس کی ایک سہیلی نے میرے بجٹ پر مزید ضرب لگانے کے لئے گرہ لگائی کہ ''وہاں ہندو صراف بھی بہت اچھے ہیں' سونے کے

زیوروں کے ایسے ایسے ڈیزائن تیار کرتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے' لوگ فرمائش کر کے وہاں سے جیولری بنواتے ہیں۔''

میں نے راولپنڈی میں ایک فوجی آفیسر سے بریفنگ لینے کی کوشش کی تو اس نے بتایا کہ لوگ یونہی بات کا بتنگڑ بنا دیے ہیں' حالات بالکل قابو میں ہیں' پہلے تو وہاں ہلکا پھلکا ایک انفنٹری ڈویژن ہوتا تھا۔ اب مکمل کور ہے (ایسٹرن کمانڈ) ذرا سی گڑبڑ پر سارے بنگالیوں کو بھون کر رکھ سکتی ہے' اطمینان سے جاؤ' مزے سے رہو' بس اپنے باس کو خوش رکھو باقی پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔''

آئی ایس پی آر کے کیپٹن احسان دانش سے الوداعی ملاقات کرنے گیا تو اس نے کہا۔ وہاں جانے میں سب سے بڑا آرام یہ ہے کہ راولپنڈی اور ڈھاکہ کے درمیان ڈائریکٹ ڈائلنگ نہیں ہے یعنی یہاں کے باس وہاں ٹیلی فون کے ذریعے تمہاری جان عذاب میں نہیں ڈال سکیں گے۔ اگر کوئی ٹرنک کال کرے گا بھی تو جی چاہا تو بات کر لینا۔ ورنہ کہہ دینا سپیچ کمزور ہے' آواز صاف سنائی نہیں دیتی' اگر یہ بہانہ نہ چلے تو کہہ دینا کمانڈر کے ساتھ باہر گئے ہیں۔

ان دنوں ایسٹ پاکستان پوسٹنگ پر اپنے گھریلو اثاثے منتقل کرنے کے لئے خصوصی گرانٹ ملتی تھی۔ میرے کل اثاثے تین تھے' ایک بیوی اور دو بچے۔ بچی چار سال کی' بیٹا دو سال کا۔ اللہ اللہ خیر سلا! سو چا نئی جگہ جا رہا ہوں پہلے جا کر اپنی جگہ بنا لو پھر بچوں کو بلوا لونگا۔

میں جنوری کی ایک حسین صبح کو پی آئی اے کے ناقابل اعتبار طیارے ٹرائڈنٹ (Trident) پر لاہور سے سوار ہوا۔ وہ اڑنے سے پہلے ہی خراب ہو گیا' ہم ساری رات ائرپورٹ اور ہوٹل کے درمیان دھکے کھاتے رہے' ڈھاکہ میں فوجی احباب محو انتظار رہے۔ ایک متبادل جہاز کے ذریعے اگلے روز ڈھاکہ پہنچا' تو لینے والے جا چکے تھے' ٹیکسی کا پوچھا تو لوگ میرا منہ دیکھنے لگے جیسے میں نے بحیرہ عرب میں کسی فٹ بال گراؤنڈ کا پوچھ لیا ہوں' تانگے کا ذکر کیا تو لوگوں نے اسی قسم کے ردعمل کا اظہار کیا۔ لے دے کر ایک سائیکل رکشہ ہاتھ میں آیا' جسے ایک منحنی سا بنگالی چلا رہا تھا' سوچا اس کے رکشا پر سواری کرنا تو اس پر سواری کرنے کے مترادف ہے۔ میں اسی شش و پنج میں ائرپورٹ پر کھڑا تھا کہ ایک ملٹری پولیس والے نے میرے قد کاٹھ سے مجھے پہچان لیا اور کہا۔ ''صاب' آپ ویسٹ پاکستان سے آئے ہیں؟'' مثبت جواب پا کر اس نے مجھے جیپ کی اگلی سیٹ پر بٹھا لیا اور چھاؤنی میں منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ راستے میں وہ بنگالیوں کی برائیاں کرتا رہا کہ بڑے جذباتی ہیں۔ تنگ نظر اور تھڑدلے ہیں' اچھا ہوا آپ رکشے پر نہیں آئے ورنہ وہ دل میں آپ کو گالیاں بھی دیتا رہتا اور جاتے ہوئے پیسے بھی بٹور لیتا۔

میں بنگلے پر پہنچا تو وہاں تھوڑا سا سرکاری فرنیچر اور موٹا سرکاری بیٹ مین گذشتہ روز سے میرا منتظر تھا۔ اس نے میرا مختصر سا سامان

نکالا' کھولا' بستر لگایا' میس سے لا کر کھانا کھلایا اور میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔ صبح اٹھ کر گردوپیش کا جائزہ لیا تو دروازے کے باہر آٹھ دس عورتوں کا جلوس دکھائی دیا' میں سمجھا یہ ضرور احتجاج کرنے آئی ہوں گی کہ ان کے محلے میں ایک ''چھڑا پنجابی'' کیسے آ گیا۔ لیکن کہنہ مشق اردلی نے بتایا کہ ''صاحب یہ ساری کی ساری غریب عورتیں ہیں' آپ کے بنگلے میں کام کرنا مانگتی ہیں' ان کی یہی گزراوقات ہے۔'' میں نے ان تک جواب بھجوایا کہ ''دس پندرہ روز بعد بیگم صاحب آئیں گی تو یہ مسئلہ طے کریں گی' فی الحال کسی کی ضرورت نہیں ہے۔''

پندرہ روز بعد بیوی آئی تو اس نے تین عورتیں ملازم رکھ لیں' ایک باورچی کانے کا کام کرنے کے لئے' ایک کپڑے دھونے کے لئے اور ایک باہر سے سودا سلف لانے کے لئے۔ میں نے آج تک ایک بیٹ مین کے علاوہ کسی نجی ملازم کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ بیوی سے اس اسراف کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ ''ان سب کی مجموعی ماہوار تنخواہ تیس روپے بنتی ہے جو میں راولپنڈی میں صرف صفائی والی کو دیتی تھی' اس کے علاوہ انہیں بچا کھچا کھانا اور پھٹا پرانا کپڑا لتا دیں گے۔ آپ کا کیا جاتا ہے' اس سے زیادہ تو آپ کو مارشل لاء الاؤنس ملے گا۔'' میں خاموش ہو گیا۔

ہیڈ کوارٹر ایسٹرن کمانڈ پہنچا تو وہاں سب لوگوں کا مورال بلند پایا' صبح صبح صرف بڑوں افسروں کو ملا اور گیارہ بجے ٹی بریک کے دوران سب کے ساتھ چکن تکا اور سینڈوچ کی بھری • طشتریوں پر ملاقات ہوئی۔ وہ بڑے صحت منداور خوش وخرم تھے۔ ایک نے اپنی توند تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں سالک صاحب اسکوائش کا شوق ہے؟'' پھر خود ہی جواب دینے لگے کہ یہاں کا موسم ایسا ہے کہ اگر باقاعدگی سے کوئی گیم نہ کھیلی جائے تو پیٹ خواہ مخواہ بڑھ جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں' ٹینس کھلتا رہا ہوں' کیا یہاں بندوبست ہے؟'' انہوں نے بتایا ''ہاں یہاں ہر چیز کا بندوبست ہے۔ ریکٹ اور بال بھی موجود ہیں۔ آج آیئے' شام کو ذرا ہو جائیں دو دو ہاتھ۔''

میں نے وہیں سکوائش کھیلنا سیکھا اور ٹینس بہتر کھیلنے لگا۔

بیویاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ آتے ہی بیچارے شوہر کو انڈر کمانڈ کر لیتی ہیں اور گھرداری کے پیچھے لگ جاتی ہیں۔ میری اہلیہ نے بھی آتے ہی حکم سنایا کہ پہلی فرصت میں گھر کی چند چیزیں خریدنی ہیں' اس نے مزید بتایا کہ یہیں چھاؤنی سے تھوڑی دور شمال کی جانب ''ٹونگی'' نامی ایک جگہ ہے جہاں ڈنر سیٹ' کافی سیٹ' ٹی سیٹ اور دیگر برتن بہ کفایت ملتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اتنے برتن اکٹھے کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ نہ سمجھی' کہنے لگی۔ ''اپنا ہی ملک ہے' خطرہ کس بات کا ہے' حلال کی کمائی سے جو اثاثے بنائیں

گے واپس پوسٹنگ پر ساتھ لے جائیں گے!" میں نے سوچا اس سادگی پہ کون نہ مرجائے۔۔۔"

ہم ٹونگی گئے تو بنگالی منیجر نے کسی تعارف کے بغیر ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ وضع قطع سے پہچان گیا کہ ہمارا تعلق مغربی پاکستان اور فوج سے ہے' اس کی میزبانی میں تعظیم وآداب کا عنصر کم اور خوف و بے یقینی کا شائبہ زیادہ تھا' اس کے کارکن اسے پنجابیوں کو چمچہ سمجھ کر اس کے خون کے پیاسے تھے' اس نے ڈرتے ڈرتے مختلف برتنوں کے نمونے دکھائے' مقررہ قیمتیں بتائیں۔ دس فی صد ڈس کاونٹ کا وعدہ کیا اور ایک مہینے بعد ڈیلوری کی تاریک دی۔ ہم نے کہا۔ "ہمیں جلدی ہے ایک ہفتے کے اندر سامان چاہیئے۔" وہ اس درخواست کو حکم سمجھا اور فوراً مان گیا' میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ مشرقی پاکستان میں تو فوجی افسر کی چلتی ہے۔

منیجر کے دفتر سے نکلے تو ایک پنجابی وضع قطع کا اونچا لمبا شخص ملا۔ وہ سویلین کپڑوں میں بھی فوجی لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "سر میرا نام حوالدار حمید ہے' میں یہاں سیکورٹی گارڈ ہوں' سر! بنگالی منیجر بڑا تابعدار آدمی ہے لیکن لیبر حرامی ہے۔ فوجی افسروں کے آرڈر کیئے ہوئے برتن جان بوجھ کر ٹیڑھے کر دیتی ہے مگر فکر نہ کریں' میں ان کے سر پر رہوں گا اور ان حرامزادوں کو ایسی کوئی حرکت نہیں کرنے دونگا"

ہم اس شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے۔

اگلے روز بیت المکرام (ڈھاکہ شہر) میں گھر کی دیگر ضروریات خریدنے گئے' تو بنگالی دکانداروں کا رویہ خاصا معنی خیز لگا۔ وہ نہ تو کھل کر مخالفت کرتے تھے اور نہ ہی دوکانداروں کی طرح بیٹھے بن کر دکانداری کرتے تھے' ان کی حالت مجھے اس بے بس عورت کی طرح لگی' جس کا نکاح اس سے پوچھے بغیر ایک ایسے شخص سے کر دیا گیا تھا جس سے طلاق لینے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

ہم نے کسی کے دل کو کریدنا مناسب نہ سمجھا اور ضروری خریداری کر کے واپس آ گئے لیکن ایک مہینے کے اندر اندر مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم پاکستان کے ایک حصے میں نہیں ہیں بلکہ کسی دیارِ غیر میں ہیں۔ جہاں کے مقامی باشندے ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہیں۔ پاکستان اندرونی طور پر بٹ چکا ہے' صرف خول کو کاٹنے کی دیر ہے۔

◆◆◆

مشرقی پاکستان: آخری ضرب

مشرقی پاکستان کی اس مخاصمانہ فضا میں ہم چھاؤنیوں کے اندر یوں دبکے بیٹھے تھے جیسے جیم میں نقطہ(ج)۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس نقطے کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ نقطہ نکل جانے سے پیچھے "ح" رہ جائے گی جسے بھارت حلوے کی طرح نگل جائیگا' لہٰذا ہم بیٹھے رہے ڈٹے رہے اور پرخشم آنکھوں اور پردشنام زبانوں کے باوجود اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

ہیڈکوارٹر ایسٹرن کمانڈ میں میری حیثیت یکے از سٹاف افسران تھی جس کا بنیادی کام فوجی کمانڈروں اور تقریبات کی پبلسٹی کرنا تھا' مزے کی بات یہ تھی کہ پبلسٹی کے سارے ذرائع بنگالیوں کے ہاتھ میں تھے' نہ صرف ریڈیو اور ٹیلی وژن کے باس اور کارکن بنگالی تھے بلکہ سارا انگریزی اور بنگالی پریس بھی ان کی گرفت میں تھا۔ اب ایک پنجابی شالا(پی آر او) ایک پنجابی جنرل کی تصویر لے کر کسی بنگالی اخبار نویس کے پاس جائے تو کس قسم کے رویے کی توقع کرسکتا ہے۔ نفرت و حقارت' گلے شکوے' گالی گلوچ؟ لیکن نہیں وہ بڑے اچھے لوگ تھے' وہ نہ صرف میری بھیجی ہوئی تصویروں اور پریس ریلیز کو صفحہ اول پر جگہ دیتے تھے بلکہ مجھے بھی دل میں بٹھاتے تھے' ان میں جو سب سے کڑوے سمجھے جاتے تھے' مجھ سے بہت ہی میٹھے تھے' میرے ان کے دو طرفہ تعلقات اتنے برادرانہ ہوگئے تھے کہ ان کی بیویاں گھر پر تنگے پاؤں ننگے سر کاٹن کی ساڑھیاں لہراتی' بھائی شالک کے لئے مچھلی چاول پکاتی تھیں بلکہ میرے پنجابی ذوق کو مطمئن کرنے کے لئے توے پر چپاتیاں بھی ڈال دیتی تھیں حالانکہ بنگالی خواتین چپاتی پکانا' بارمونیم اور ستار بجانے سے زیادہ مشکل سمجھتی ہیں۔

اس خیر سگالی میں میرا کوئی کمال نہ تھا' دراصل وہ خود بڑے محبت کرنے والے لوگ تھے' اگر میں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ محبت کے پیاسے تھے' اگر ان کی محبت کا جواب محبت سے دیا جاتا' تو وہ بچھ جاتے تھے اور اگر ان سے رعونت اور بالادستی کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ بچھو بن جاتے تھے۔ ان دو مشکل برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو نفرت' بعد اور علیحدگی کا ذمہ دار اپنے آپ کو اور اپنے مغربی پاکستانی ساتھیوں کو زیادہ گردانتا ہوں کیوں کہ اگر آپ بطور چیف سیکرٹری ان کو اپنے دفتر کے قریب پھٹکنے نہیں دیں گے' بطور ڈپٹی کمشنر انہیں پہروں برآمدے میں بٹھائے رکھیں گے یا بطور آرمی آفیسر ریل گاڑی سے ان کو اتار کر زبردستی اپنے مہمان سوار کرادیں گے تو وہ یقیناً یہ سمجھنے میں حق بجانب ہونگے کہ ہم نے ۱۹۴۷ میں آزادی نہیں پائی' صرف آقا بدلے ہیں۔ چھاؤنی کے اندر بنگالیوں کے خلاف

خاصا تعصب پایا جاتا تھا جو ممکن ہے بنگالیوں کے دل میں پائے جانے والے تعصب کا عکس ہو لیکن اس دوطرفہ تعصب کو دور کرنے کی ذمہ داری بھی مغربی پاکستانیوں پر تھی' کیونکہ وہ ہی غالب حالت میں تھے۔

بعض وفاقی پالیسیاں بھی ناقابل فہم تھیں مثلاً بنگالی تاجر اور صنعتکار اکثر گلہ کرتے تھے کہ شالک صاحب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم چٹاگانگ میں ربڑ انڈسٹری لگانے کے لیے جاپان سے مال خریدتے ہیں' تو بحری جہاز ہماری بغل سے ہوتا ہوا سیدھا کراچی جاتا ہے' پھر وہاں چیکنگ اور ڈیوٹی وغیرہ ادا کرنے کے بعد واپس چٹاگانگ بھیجا جاتا ہے' اسی طرح ہم بنگال میں جوٹ کے رسے اور فوج کے لیے کیموفلاج نیٹ تیار کرتے ہیں' ان کی ضرورت یہاں فوج کو ہے لیکن حکم ملتا ہے کہ پہلے مغربی پاکستان بھیجو' وہاں سے منظور کراؤ اور پھر اس کی واپس شپ منٹ کا انتظام کرو' یوں لگتا ہے کہ جب تک مغربی پاکستان کے مقدس ہاتھ کسی شے کو چھو نہ لیں۔ بنگالیوں کے لئے لائق استعمال نہیں ہوسکتی۔

ان کی شکایت میں مجھے یوں بھی وزن نظر آیا کہ میرے پاس جو سرکاری فوٹوگرافر تھا' اسے عارضی طور پر ڈھاکہ سے باہر ٹونگی یا کومیلا بھیجنے کے لیے مجھے جی ایچ کیو سے منظوری لینا پڑتی تھی' جس میں مہینے لگ جاتے تھے۔ جب کہ ڈیوٹی کی نوعیت ایسی ہوتی تھی کہ اسے ایک دن میں کام کرکے واپس ڈھاکہ پہنچنا ہوتا تھا۔ اس کے پس منظر میں صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کچھ ایسا ناجائز بھی نہ تھا' البتہ اگر اس کے پس پردہ ملک کو دولخت کرنے کی کوئی سازش تھی تو مجھے اس کا علم نہ تھا۔

ہم نے چھاؤنی میں اپنی الگ دنیا بسا رکھی تھی' ایک دوست آرڈیننس سے تعلق رکھتے تھے' چونکہ اکثر قہقہوں کے دھماکے کرتے رہتے تھے' دوسرے کور آف سگنلز کے رکن تھے اور ہر سطح پر رابطے کا کام دیتے تھے۔ ان کے طفیل ہم اکثر مغربی پاکستان میں مقیم دوستوں اور اہل وعیال سے گپ لگا لیتے تھے' سب سے مفید ڈاکٹر ہاشمی تھے جو ملٹری پولیس کی نگاہیں بچاتے ہوئے ہمیں اپنی ایمبولنس گاڑی میں بٹھا کر سینما دکھانے لے جاتے تھے' اس پر آرمڈ کور کے میجر شبیر نے کہا۔

اگر ایسی بات ہے تو میں اپنا ٹینک لے جاؤں گا' اس میں چار سواریوں کی گنجائش ہوتی ہے۔

ہمارا سب سے زیادہ مذاق ایجوکیشن کور کے لیفٹیننٹ کرنل بشیر سے چلتا تھا۔ ہم اکثر اسے چھیڑتے تھے کہ اپنے کندھوں پر اے ای سی (آرمی ایجوکیشن کور) کے حروف سجا کر اپنے علم کی تشہیر کرنا بہت بڑا اوچھا پن ہے۔ اس کے برعکس ہمیں دیکھو کہ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ایم اے کر رکھے ہیں' لیکن کندھوں پر فرنٹیئر فورس پہن کر پھرتے ہیں کہ کسی کو شک نہ ہو' تعلیم یافتہ ہونا اچھا سہی' لیکن اس کی تشہیر کرنا سراسر جہالت ہے۔ وہ جواباً فرمایا کرتے کہ دیکھو ہم ایجوکیشن کور والوں کا کام تعلیم بالغاں ہے۔ اگر ایجوکیشن کور نہ ہوتی تو نہ سپاہی پیشہ

وارانہ امتحان پاس کر کے این سی او بن سکتے اور نہ افسر کیپٹن ٹو میجر کا پروموشن اگیزامینیشن پاس کر سکتے (یہ اور بات ہے کہ ایجوکیشن والے خود ان میں بعض اوقات فیل ہو جاتے ہیں)

ہمارے درمیان ایک توپچی میجر رب نواز پھنسا ہوا تھا جو سوائے توپ چلانے کے کچھ نہ جانتا تھا۔ وہ ہماری چھیڑ چھاڑ سے اکثر محظوظ ہوتا تھا۔ بولتا کم لیکن ہنستا سب سے اونچا تھا' اس کے بلند و بالا قہقہوں سے بچے عموماً نیند سے بیدار ہو جاتے تھے اور کوے درختوں سے اڑ جایا کرتے تھے۔

ایک دن کرنل بشیر کو شہر میں کسی اخبار والے سے کوئی کام پڑ گیا۔ مجھے سفارش کے لئے ساتھ لے گئے' وہاں ہمیں دو بہاری اخبار نویس مل گئے جن کے سیاہ چہروں پر سفید آنکھیں اور سفید دانت بڑی بہار دے رہے تھے' رہی سہی کسر منہ کے گوشوں سے بہنے والی پان کی پیک پوری کر رہی تھی' بہاری یوں تو شروع سے ہی جاں نثاراں پاکستان چلے آ رہے تھے لیکن اس فضا میں وہ فوجیوں پر خاص مہربان تھے' انہوں نے ہمیں زبردستی چائے پر روک لیا اور ہم کوشش کے باوجود جلد نہ اٹھ سکے' شام کو واپس چھاؤنی پہنچے تو میجر رب نواز خاصا گرم تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا۔ ''یار و تسی کمال کر دتا اے۔ سارا دن لگا دیا' میں یہاں ساری افٹر نون اکیلا پکوڑے اور پاپڑ کھا کھا کر تنگ آ چکا ہوں'' کرنل بشیر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' کہ سارا قصور سالک کا ہے جس کی دو پیشہ ور ساتھی مل گئی تھیں'' صیغہ تانیث سن کر رب نواز کے کان کھڑے ہو گئے۔ حیرت سے بولا۔ ہائیں' یہ تو بڑا شریف بنتا تھا'' بشیر نے کہا۔'' بس اس زمانے میں کسی کی شرافت کا کیا اعتبار''

کون تھیں وہ؟

ایک کا نام تھا مس دلربا اور دوسری کا نام مس دلپذیر''

''کیا کرتی ہیں وہ''

''ہفت روزہ محبت نکالتی ہیں اور سالک صاحب اس میں کالم لکھتے ہیں''

ربنواز نے کمال سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں' ہمارا یار رائٹر تو ہے' نا''

ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کچھ عرصے بعد کیپٹن انور بھی ڈھاکہ پہنچ گئے' وہی انور جو دو سالوں میں فرنٹیئر کور والوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ

ب کا نقطہ اوپر نہیں نیچے لگایا جاتا ہے' انہوں نے ہماری محفلوں میں مزید زعفران بکھیرنا شروع کیا' مثلاً ایک موقع پر انہوں نے حسب ذیل واقعہ سنایا۔

''جنرل نیازی تقریباً ہر مہینے سپاہیوں کے نام ایک طبع شدہ پیغام بھیجا کرتے تھے کہ تم اسلام کے سپاہی اور اللہ کے مجاہد ہو' ان دنوں تمہارا سامنا کفر و الحاد سے ہے' ایسے موقع پر شہادت ہی ہر مسلمان کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے' لہٰذا تم کافر کی عوی برتری اور ساز و سامان کے انباروں کو خاطر میں نہ لاؤ' میدان عمل میں کود پڑو اور جام شہادت نوش فرماؤ وغیرہ۔ رنگپور چھاؤنی کے دورے میں چند سپاہیوں نے ہر ماہ پیغام بھیجنے والے جنرل نیازی کو گوشت پوست کی حالت میں دیکھ لیا۔ جب سپاہی ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے' تو یہ چکن پلیٹ تھامے گندے لطیفے سنا رہے تھے' سپاہیوں نے جب اپنے سپہ سالار کو یوں اسلام سے عاری دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''چھڈ یار اس کے بھیجے ہوئے پیغام پر نہ جانا۔ شہادت کے لالچ میں کہیں جان سے ہی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔''

اس پر پہلے تو ہم ہنسے کیوں کہ انور کی باتوں پر ہنسنا ہماری فطرت ثانی بن چکی تھی' لیکن جونہی اس کا مطلب سمجھ میں آیا تو ہم سنجیدہ ہو گئے' جس کمانڈر سے اس کے سپاہیوں کا اعتماد اٹھ جائے وہ کیا خاک کمان کرے گا؟

اس گپ شپ کے علاوہ وہاں کچھ سنجیدہ کام بھی ہوتا تھا' مثلاً کچھ لوگ بڑی سنجیدگی سے برج بھی کھیلتے تھے اور کچھ بڑی باقاعدگی سے کاغذی لڑائی لڑتے تھے۔ دونوں کا مختصر ذکر بے محل نہ ہوگا۔

مارچ ۱۹۷۱ سے پہلے بہت سے آفیسر فیملی سمیت وہاں رہتے تھے' بنگلوں کی کمی کے باعث کئی بچارے میس میں پڑے تھے۔ میس کے باسی صبح و شام آزادانہ شہر تو جا نہیں سکتے تھے' اس لئے اکثر فارغ وقت میں برج کھیلتے رہتے تھے' کہتے ہیں برج کھیلنے کا نشہ شادی شدہ زندگی سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے اور جس کو یہ نشہ چڑھ جائے وہ بال بچے کی پرواہ کیے بغیر پہروں بلکہ کئی دنوں تک برج کھیل سکتا ہے۔ ڈھاکہ کے ایک بریگیڈئر کمانڈر جن کی دونوں بیویاں مغربی پاکستان میں ان کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ ڈھاکہ میں برج پر گزارہ کر رہے تھے جو اگرچہ اپنی جگہ خاصا نقصان دہ تھا مگر متبادل مصروفیات کے مقابلے میں بالکل بے ضرر تھا۔ چنانچہ وہ ڈیڑھ دو بجے تک نوکری کرتے (اور اپنے ماتحتوں سے نوکری کرواتے) اور دوپہر کے کھانے کے بعد برج کی بازی جما کر بیٹھ جاتے۔ ان کے نیچے تین لیفٹیننٹ کرنل تھے' جن میں دو برج کے کھلاڑی تھے مگر فیملی سمیت بنگلوں میں رہتے تھے' انہوں نے برج کی چوکڑی' پوری کرنے کے لئے تیسرے لیفٹیننٹ کرنل کو برج سکھانے کی کوشش کی لیکن دانستہ یا غیر دانستہ طور پر وہ ان کے معیار پر پورا نہ اتر سکے۔ انہوں نے اس کی جگہ ایک اور لیفٹیننٹ کرنل پوسٹ کروا لیا اور یوں تینوں لیفٹیننٹ کرنل اپنے بریگیڈ کمانڈر کے ساتھ برج میں جت

گئے۔ ویسے بھی فوج میں جونیئر یا ماتحت افسر اپنے باس کی دلچسپی میں جت جانا عموماً باعث مسرت سمجھتے ہیں۔

سارا سال تو نہیں مگر بعض اوقات ان کی برج کی بازی ایسی جمتی کہ اکھڑنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اول تو کھانا پینا حرام ہوتا تھا لیکن اگر میس ویٹر بار بار سہ پہر کی چائے یا شام کے کھانے کی یاددھانی کراتا تو اسے کہا جاتا کہ ''یہیں لے آؤ'' وہیں ایک ہاتھ میں تاش کے پتے اور دوسرے ہاتھ میں لقمہ' پتے پر پتے اور لقمے پر لقمہ! ایک مرتبہ یہ میچ متواتر تین راتوں تک جاری رہا' دن کو نوکری کرتے' سہ پہر کو تاش پر بیٹھتے = ساری شام اور ساری رات کھیلتے رہتے' صبح اپنے اپنے مقام پر شیو کرتے اور کپڑے بدل کر دفتر آجاتے۔ ایک لیفٹیننٹ کرنل کو پتہ نہیں گھر سے جھاڑ پڑی یا واقعی تین دن کی شب بیداری اثر دکھانے لگی کہ انہوں نے چوتھے دن دبے الفاظ میں معذرت چاہی' بریگیڈئر صاحب اس گستاخی پر بپھر گئے' کرنل صاحب نے پیشہ ورانہ امور کا سہارا لیا اور کہا۔ ''کہ سر! ہم یہاں برج کھیلنے نہیں آتے' ہمیں غیر معمولی صورت حال کا سامنا ہے' پتہ نہیں کب جنگ لڑنی پڑ جائے' ہمیں اپنی پوری توجہ جنگ کی تیاری پر صرف کرنی چاہیے۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے اپنے فرائض کا احساس نہیں''

''سر! ضرور احساس ہوگا لیکن تین دن اور تین راتوں سے یہ برج۔۔۔''

''تم کیسے کند ذہن افسر ہو' سمجھتے کیوں نہیں کہ یہ جگ رتہ بھی جنگی تیار کا حصہ ہے' تمہیں یاد نہیں ۱۹۶۵ کی لڑائی میں ہمارے اکثر افسر کئی کئی راتوں تک سو نہیں سکے تھے۔ یہی حال اگلی جنگ میں بھی ہوسکتا ہے' جب تک متواتر کئی کئی راتوں تک جاگنے کی مشق نہیں کرو گے' کیسے جنگ لڑو گے۔ یہ برج تو محض بہانہ ہے' اصل مقصد آپ کو جنگی حالات کے لئے تیار کرنا ہے ورنہ تم تو دوسرے دن ہی بیمار مرغی کی طرح ہچکولے کھانے لگو گے۔''

اس وعظ سے یہ کرنل صاحب تو قائل ہو گئے لیکن دوسرے دو افسروں کی بیویاں قائل نہ ہوسکیں۔ لیفٹیننٹ کرنل افضل کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ کور آف سگنلز کے کرنل افتخار رہتے تھے جو اسی چھاؤنی میں کام کرتے تھے۔ وہ وقت پر چھٹی کر کے سیدھے بیوی بچوں کے پاس پہنچتے تھے' ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے تھے اور باقی وقت ان کے ساتھ گزارتے تھے۔ برج کے رسیا کرنل افضل کی بیوی سے ایک دن مسز افتخار نے پوچھا۔ کہ تمہارا میاں روزانہ لیٹ کیوں آتا ہے۔ وہ بولی۔ ''میں جب پوچھتی ہوں کہتا ہے جنرل صاحب نے اسے اور اس کے بریگیڈئر کو کوئی اہم کام دے رکھا ہے۔'' میں کہتی ہوں افتخار بھائی بھی تو اسی جرنیل کے انڈر ہیں' انہیں کام کیوں نہیں دیتے؟'' تو انہوں نے جو جواب دیا تھا اس کے بارے میں کہا تھا کہ بھابھی بھائی افتخار کو نہ بتانا۔

''ہائے بہن' میں کون سا انہیں بتانے چلی ہوں کیا کہا تھا انہوں نے؟''

''اب بہن تجھ سے کیا پردہ' افضل کہہ رہے تھے کہ افتخار بھائی نالائق ہیں کمانڈر کو اس پر اعتماد نہیں' اس لئے چھٹی ہوتے ہی انہیں چلتا کرتے ہیں''

''ہائیں' میرا میاں نالائق ہے' میں آج ہی اس سے پوچھوں گی'' مسز افتخار فوراً تن گئیں۔

مسز افضل نے اسے خاموش رہنے کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بہن تم نے وعدہ کیا تھا کہ یہ بات اپنے تک محدود رکھو گی۔۔۔۔پلیز' پردیس میں لڑائی مت کروانا''

یہ جھگڑا اطمینان بخش طور پر طے تو نہ ہوا لیکن وقتی طور پر سیز فائر ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد جی ایچ کیو سے خبر آئی کہ (نالائق) لیفٹیننٹ کرنل افتخار فل کرنل ہو گئے ہیں اور بریگیڈیئر صاحب کے منظور نظر اور برج کے ماہر' لیفٹیننٹ کرنل افضل ترقی سے محروم رہ گئے ہیں' اب جو راز کھلا تو دونوں بیگمات کی لڑائی پوری چھاؤنی کا موضوع گفتگو بن گئی۔

دوسری طرف کاغذی لڑائی لڑنے والے بھی کچھ کم مصروف نہ تھے وہ پیشہ ورانہ نوعیت کی جنگی مشقیں کرتے رہتے تھے' جنھیں کبھی 'War Game' کبھی Tewt اور کبھی Sand Model discussion کا نام دیا جاتا۔ اگرچہ ایسی جنگجوانہ حرکتوں سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہ تھا لیکن ایک دوست میرے علم میں اضافے کے بہانے مجھے وہاں لے گئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں ایک تخیلاتی جنگی صورت حال پینٹ کی گئی ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ۔

''آپ کے پاس صرف تین انفنٹری ڈویژن ہیں' جن سے آپ نے پورے مشرقی پاکستان کا دفاع کرنا ہے' اگرچہ آپ کے پاس ایئر فورس ہے لیکن سمجھ لیجیے کہ وہ چوبیس گھنٹے کے بعد گراؤنڈ ہو چکی ہے۔ نیوی بے اثر ہونے کی وجہ سے خلیج بنگال کی طرف سے دشمن کے بحری حملے کا پورا امکان ہے' زمینی جنگ کے لئے آپ کو اس صورت حال کا سامنا ہے کہ صوبے کے اندر تخریب کار اور دیگر مخاصمت پسند عناصر سرگرم عمل ہیں اور باہر سے دشمن پوری قوت سے آپ پر حملہ کرتا ہے۔ آپ صوبے کا دفاع کس طرح کریں گے''

اب خالص فوجی انداز میں صورت حال کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور ہر فوجی ماہر جن میں سٹاف کالج کوئٹہ کے علاوہ لندن' امریکہ اور آسٹریلیا کے تربیت یافتہ افسر بھی شامل ہیں' اپنی اپنی رائے دے رہے ہیں۔ ان کی ساری عسکری دانش تو میرے پلے نہ پڑی مگر کچھ کچھ جملے یاد رہ گئے مثلاً ایک نے کہا۔

’’پہلے تو میں توپوں کی گولہ باری سے سرحد کے پار جمع شدہ دشمن کو تتر بتر کروں گا پھر اپنی ایک بٹالین کو اپنی صفوں کے پیچھے کا علاقہ Sweep کرنے پر لگادوں گا۔ یہ کاروائی چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پوری کی جائیگی اور اس دوران اس بریگیڈ کی دو پلٹنیں دشمن کی غیر متوقع یلغار کے لئے تیار رہیں گی۔ Flanks کے تحفظ کے لیے میں پڑوسی بریگیڈ کا سہارا لوں گا۔‘‘

دوسرے نے کہا۔

’’مجھے جو وسائل دیئے گئے ہیں' ان میں ایک کمپنی کمانڈوز کی ہے' میں رات کی تاریکی میں کمانڈوز کو دشمن کے عقب میں لانچ کر دوں گا' اور جونہی اس کی صفوں میں کھلبلی مچے گی' میں سامنے سے حملہ کر دوں گا' آرمڈ اور آرٹلری کا بھرپور استعمال کروں گا۔ دائیں اور بائیں جانب سے ایسی Pincer move کروں گا کہ دشمن میری فوس کے Lock میں آجائے گا اور میں اسے وہیں کرش کردوں گا۔‘‘

تیسرے نے کہا۔

’’میرا پلان Deception اور Surprise پر مبنی ہوگا' میں سب سے پہلے دشمن کو اپنی پسپائی کا تاثر دونگا' وہ بلاشبہ آگے بڑھے گا کیونکہ Grabbing Land اس کا پرائمری مشن ہے لیکن جونہی وہ اپنی Neck اندر پھنسادے گا' میں پورے بریگیڈ کی قوت سے اس کو Strike کروں گا اور دولخت کر کے رکھ دونگا۔‘‘

ایک اور صاحب بولے۔

’’میں Fortress Defence Policy اپناؤں گا' اپنی ساری قوت ایک مرکزی جگہ پر اکٹھی کرونگا' وہیں راشن' ایمونیشن اور اسلحہ سٹاک کروں گا' آگے صرف ایک سیکشن کی سکرین رکھونگا اور دشمن کو پیش قدمی کرنے اور موت کی وادی میں داخل ہونے کا موقع دونگا' وہ آگے بڑھے گا اور میرے Fortress کو ایک چٹان کی طرح چھوڑتا ہوا بہتے پانی کی طرح دائیں بائیں سے گزر جائے گا جونہی اس کا tail میرے لیے Expose ہوگا' میں حملہ آور ہوں گا' اس کی دم پر پیر رکھوں گا اور اس کے پورے بریگیڈ کو Recoil کرنے پر مجبور کردوں گا!

یہ بحث کوئی دو گھنٹے تک جاری رہی' میں نئی نئی انگریزی کی نئی نئی تراکیب نوٹ کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ پتہ نہیں وقت آنے پر ان میں سے کوئی ترکیب کام بھی آتی ہے یا نہیں۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے میں نے کرنل شریف سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے' اس نے کہا۔ یہ خوامخواہ انگریزی کی ٹانگ

توڑ رہے ہیں' مجھے ایک پلٹن نفری دے دیں' میں اندرون ملک سارے شر پسندوں کو ایک دن میں ملیامیٹ کردوں گا۔

میں نے لقمہ دیتے ہوئے کہا۔

''اور باہر والے شر پسندوں کو کیسے روکیں گے''

''انہیں آپ نہیں روک سکتے خواہ تین انفنٹری ڈویژن اور لے آؤ۔''

''کیوں''؟

''کیوں کہ مشرقی پاکستان کی جنگ کوئی روائتی جنگ نہیں ہوگی' آپ اپنے بیس یعنی مغربی پاکستان سے کٹے ہوئے ہوں گے۔ دشمن کو فضائی برتری حاصل ہوگی' لوکل پاپولیشن آپ کے خلاف اور ان کی حمایت میں ہوگی۔ آپ کے تین انفنٹری ڈویژن بھی تو نام کے ہی ہیں' ان کے پاس نہ بھاری توپ خانہ ہے' نہ ٹینک ہیں' آپ رائفلوں اور آر آر گنز کے ساتھ کب تک مقابلہ کریں گے۔ بس دعا کرو اللہ تعالیٰ ہمارے بڑوں کو ہدایت دے اور خدا ہمیں امتحان میں نہ ڈالے ورنہ یہ ساری انگریزی دھری کی دھری رہ جائے گی''

ان کا یہ مایوس کن مگر حقیقت پسندانہ تجزیہ سن کر میں خاموش ہوگیا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد یہ سارے مفروضے حقیقت کا رنگ دھارنے لگے' پہلے خانہ جنگی شروع ہوئی' پھر باقاعدہ جنگ' خانہ جنگی سے تو ہم جوں توں نپٹ رہے تھے کہ راولپنڈی میں بیٹھے بٹھائے کسی نپولین نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان پر دباؤ کم کرنے کے لیے مغربی جانب سے ہندوستان پر حملہ کردیا جائے۔ اس حملے کا اثر یہ ہوا کہ ہم پر دباؤ مزید بڑھ گیا جس میں ہماری چارچوکڑی بھی بکھر گئی۔ میجر غفور جو ہمارے گروپ میں' دونوں ہاتھوں کی تالی سے چالاک مچھر یا مکھی کو شہید کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے' ہمیں چھوڑ کر اپنی رجمنٹ میں چلے گئے۔ ان کا رویہ خالص سپاہیانہ تھا' انہوں نے الوداعی سلام کہتے ہوئے کہا۔ ادھر میری رجمنٹ معرکہ حق و باطل میں مصروف ہے اور میں یہاں بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔ حیف ہے مجھ پر' یہ کہہ کر وہ چلتے بنے۔ ہم نے دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا اور مکھیاں اور مچھر مارنے کا اضافی چارج انور کو دے دیا۔

ہیڈ کوارٹر میں لڑاکا (Combatant) افسر تو دن رات مصروف تھے' البتہ ہم نسبتاً بیکار تھے۔ جنگی کارکردگی کچھ ایسی نہ تھی کہ اس کی تشہیر کرتے اور نہ اس آخری وقت میں کرنل بشیر مزید ایجوکیشن دے کر صورت حال بہتر بنا سکتے تھے' لہٰذا ہمارا زیادہ تر کام سائرن بجتے ہی لوہے کا ٹوپ (سٹیل ہیلمٹ) پہن کر حفاظتی خندق میں کود جانا اور خطرہ ٹلنے تک وہاں دبکے رہنا تھا۔ یہ ڈرل کرتے کرتے میں اکتا گیا تو ایک دن اپنی چار یاری کو بتائے بغیر چھاؤنی سے باہر نکل گیا۔ وہاں سماں ہی دوسرا تھا' سپاہی دشمن کے جہازوں کی یلغار

سے بے نیاز اپنے کام کاج میں مصروف تھے اور طیارہ شکن توپوں پر متعین توپچی کھلی فضا میں کھڑے حملہ آور جہازوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ کہتے ہیں بزدلی کی طرح بہادری بھی متعدی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کو لگ جاتی ہے' میں جو ہیڈ کوارٹر میں ہوائی حملے سے ڈر کر بدک جایا کرتا تھا' توپچیوں کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر خود کو شیر محسوس کرنے لگا۔ جونہی طیارہ نظر آتا وہ زور سے نعرہ تکبیر لگاتے' ساتھ موٹی سی گالی دیتے اور کہتے ''پھنڈک دے سو'' (یعنی مار گراؤ) توپیں پرانی تھیں' طیارے تیز تر' لہٰذا وہ میرے سامنے کوئی طیارہ گرا تو نہ سکے لیکن توپوں کی تڑتڑ اور نعرہ تکبیر کی للکار سے وہ انہیں دور بھگانے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔

ہم جنگ شروع ہونے کے بعد بہت جلد اس کے اختتام کو پہنچ گئے' یوں لگتا تھا کہ مغربی پاکستان نے یہ سارا دھندہ دو سالہ پرانا جھمیلا جلد از جلد نمٹانے کے لئے شروع کیا تھا کیونکہ جنگ کے تیسرے دن جنرل نیازی کے اعصاب جواب دے گئے تھے' وہ باہر شیر اور اندر گیدڑ تھے۔ ایک طرف وہ ائر پورٹ پر غیر ملکی صحافیوں کے سامنے سینہ تان کر کہہ رہے تھے کہ دشمن کو ڈھاکہ میں داخل ہونے کے لئے میری چھاتی پر سے ٹینک گزارنے ہوں گے اور دوسری طرف گورنر ہاؤس میں ویٹروں کے سامنے سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے (ان ایام کی لحہ بہ لحہ کاروائی ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں درج ہے)

بالآخر جنرل نیازی نے ۱۶ دسمبر کو ہتھیار ڈال دیئے' جیم کا نقطہ سنگینوں سے کرید کر نکال دیا گیا اور بھارت نے مشرقی پاکستان کا ح سے حلوہ بنا دیا۔

صاحبزادہ یعقوب، ٹکا اور نیازی

یوں تو پبلک ریلیشنز والوں کا ہر کوئی باس ہوتا ہے لیکن قیام ڈھاکہ کے دوران میرے جائز' شرعی اور سرکاری باس تین تھے جن کے زیر سایہ میں نے وہاں تین ادوار گزارے۔ آزادی' خانہ جنگی اور خانہ بربادی' ان تینوں ادوار کے نام تھے لیفٹیننٹ جنرل یعقوب خان' لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان اور لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی!

میں جنوری ۱۹۷۰ میں ڈھاکہ پہنچا تو لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب خان کمانڈر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون 'بی' تھے' ان کا فوجی دفتر چھاؤنی میں اور مارشل لاء ہیڈکوارٹر شہر (ایوب نگر) میں واقع تھا' ان کے شب و روز اپنے پیشہ ورانہ امور میں صرف ہوتے تھے اور انہوں نے میرے آنے یا نہ آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میں بھی آتے ہی اپنے پیشہ ورانہ امور' میں مصروف ہو گیا اور میں نے بھی ان کا زیادہ نوٹس نہ لیا کیونکہ ان کے نیچے بہت سے بریگیڈئر اور کرنل تھے جو بلاوجہ میرا اکثر نوٹس لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ورانہ امور' میں مصروف ہو گیا اور میں نے بھی ان کا زیادہ نوٹس نہ لیا کیونکہ ان کے نیچے بہت سے بریگیڈئر اور کرنل تھے جو بلاوجہ میرا اکثر نوٹس لیتے رہتے تھے۔ مثلاً اخبار میں یہ کیا چھپ گیا؟ فلاں جگہ ٹی وی والا کیوں نہیں پہنچا؟ فلاں فوجی خبر صفحہ اول پر کیوں نہیں چھپی وغیرہ۔ ان گوناگوں مصروفیات میں صاحبزادہ یعقوب اور میں ایک دوسرے سے محفوظ فاصلے پر آپریٹ (Operate) کرتے رہے۔

کوئی مہینے ڈیڑھ مہینے بعد میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر تھوڑی سی انگریزی لکھی اور ٹائپ کروا کر ان کے مارشل لا ہیڈکوارٹر میں بھجوا دی' اس انگریزی کا لب لباب یہ تھا کہ اخبارات میں ملٹری کورٹس کو عطا کردہ سزاؤں کی خبریں تو اکثر چھپتی رہتی ہیں لیکن فوج کی پیشہ ورانہ مصروفیات۔ مثلاً ٹریننگ وغیرہ۔۔۔ کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی' یوں لگتا ہے کہ پوری ایسٹرن کمانڈ صرف جلوسوں کو روکنے' کرفیو نافذ کرنے اور ناہنجاروں کو سزائیں سنانے کے سوا کچھ نہیں کر رہی۔

''ڈاک پیڈ'' میں جنرل صاحب کی نظر میرے اس ''پروانہ پی آر'' پر پڑ گئی' انہوں نے مجھے طلب فرما لیا۔ اب جب تھری سٹار جنرل ایک کچے پکے میجر کو طلب کرلے تو ذہن پھولوں کے گلدستوں کی بجائے کانٹوں کے ہار کی طرف زیادہ جاتا ہے۔ چنانچہ میں اس قسم کے جملے سننے کے لئے تیار ہو گیا۔

''یہ تم نے ایک مہینے کے اندر اندر اعلیٰ ہیڈکوارٹر کی کارکردگی پر تبصرہ کیوں کر دیا'' ''میجر' جرنیلوں کی اے سی آر کب سے لکھنے لگ

گئے؟''

''اخبارات کے پیدا کردہ غلط تاثر کو ٹھیک کرنا تمہارا کام ہے نہ کہ ہمارا'' اور اختتامی جملہ کچھ اس قسم کا بھی ہو سکتا تھا۔

You bloody well mind your own business

(تم اپنے کام سے کام رکھو)

لیکن جب میں ان کے دفتر میں پہنچا تو ہر قسم کے کاغذوں سے پاک میز کے اس پار مجھے ایک سلجھا ہوا شخص نظر آیا۔ مقدور بھر سلیوٹ کیا جس کے جواب میں انہوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا' سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا' چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ زیادہ تر جملے انگریزی میں تھے اور چند ایک اردو میں۔ لیکن ہر جملے کی تراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی منجھا ہوا صراف بیٹھا ہے جو سونے کی ڈلیاں ڈھال ڈھال کر ان کے نطق کے ذریعے لنڈھا رہا ہے۔ میرا جی چاہا میں ان جملوں کو نوٹ کر لوں نفس مضمون کی وجہ سے کم اور ساخت و پرداخت کی وجہ سے زیادہ!

پڑھا ہے' تم نے بڑے وقت پر بڑے پتے کی بات کہی ہے' بتایئے اس تاثر کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے اور آپ پی آر کے میدان میں کیا کرینگے۔

ان کے بعد گفتگو کا رخ مشرقی پاکستان کی صورت حال کی طرف مڑ گیا۔ کچھ سیاسی پیچ و خم پر بات ہوئی کچھ بنگالی صحافیوں کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ آخر میں انہوں نے میرے تعلیمی پس منظر اور سابقہ صحافتی تجربات کے متعلق پوچھا اور یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ مجھ سے رابطہ رکھیئے۔

اس کے بعد انہوں نے ہر سوموار کو صبح نو بجے مجھے بلانا شروع کر دیا' حسب معمول وخوش دلی سے میرا استقبال کرتے' چائے کی ایک پیالی کے ساتھ دو نمکین بسکٹ کھلاتے اور آدھ پون گھنٹہ مشرقی پاکستان کی سیاسی' اقتصادی' عسکری اور صحافتی زندگی کے بارے میں تبادلہ خیال فرماتے۔

پھر وہ میری درخواست پر ہر مہینے باقاعدگی سے بنگالی مدیروں سے ملنے لگے' غالباً کسی اور کی دعوت پر بلبل اکیڈیمی بھی جاتے رہے اور شائد از خود قومی ضروریات کے پیش نظر وہاں کے سیاستدانوں سے بھی ملتے رہے' انہوں نے ان ملاقاتوں کے ذریعے تشنج کی فضا کو خاصی حد تک قابل برداشت ماحول میں بدل دیا۔

پھر ایک دن ان کی قیادت کے امتحان کا وقت آ پہنچا۔

۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو جنرل یحیٰی خان نے' یکم مارچ ۱۹۷۱ کو ڈھاکہ میں منعقد ہونے والا قومی اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا۔ بنگالیوں نے اس اقدام کو انہیں اقتدار سے محروم رکھنے کی سازش قرار دیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جو ان دنوں بنگالیوں کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے تھے گورنر ہاؤس (ڈھاکہ) میں تشریف لائے۔ گورنر وائس ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن لیفٹیننٹ جنرل یعقوب اور میجر جنرل راؤ فرمان علی سے ملے اور ان سے استدعا کی کہ مجھے اسمبلی کے اجلاس کی نئی تاریخ لے دو ورنہ میں بنگالیوں کے غم و غصے کو نہیں روک سکوں گا۔ لہٰذا ان فوجی اکابرین نے مغربی پاکستان ٹیلیفون کھڑکھڑائے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مجیب نے ادھر سے مایوس ہو کر بنگالیوں کی طرف رخ کیا۔ دھواں دھار تقریر کی اور سامعین کے جذبات کو یوں ابھارا کہ لگتا تھا کہ یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہر شے کو نگل جائے گا۔

فوجیوں نے فوج کے ذریعے اس کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ تین دن کے اندر واضح ہو گیا کہ صوبے کا نظم و نسق عملاً شیخ مجیب کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے کیونکہ لوگ اس کے کہنے پر دکانیں بند کرتے تھے۔ فیکٹریاں اسی کے حکم پر کام روک دیتی تھیں حتیٰ کہ سرکاری ملازم اسی کے کہنے پر دفتروں کا بائیکاٹ کرتے تھے اور بینک اسی کے حکم پر ہڑتالی ملازموں کو تنخواہ دے کر دوبارہ بند ہو جاتے تھے۔ ان حالات میں جنرل یعقوب نے استعفیٰ دے دیا (اس کی وجوہات اور دیگر تفصیلات میری کتاب' میں ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا' میں درج ہیں۔)

ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل ٹکا خان تشریف لائے۔ ۷ مارچ کو ساڑھے تین بجے ڈھاکہ ائر پورٹ پر پہنچے۔ ان کی آمد سے پہلے صاحبزادہ یعقوب خاں سمیت ہم سب ائر پورٹ پر ان کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ لمحات بڑے تاریخی تھے۔ ہم آزادی اور خانہ جنگی کے دوراہے پر کھڑے تھے' ہمارے ایک طرف وی آئی پی لاونج کا ڈھلتا سایہ اور ذرا ہٹ کر چمکیلی دھوپ کا سماں تھا۔ جنرل یعقوب اپنے چھریرے بدن پر ملائم سی وردی پہنے بار بار اپنی چھڑی (Baton) سے اپنی پنڈلیاں جھاڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا اندرونی خلفشار کو جھاڑ رہے ہیں' میں ان کے پیچھے گم سم کھڑا سارے منظر کو ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔ اتنے میں انہوں نے پیچھے مڑ کر پوچھا ''فلائٹ آنے میں کتنے منٹ باقی ہیں''۔ اس وقت ان کا سفید رنگ مزید سفید لگ رہا تھا اور ان کی آنکھوں کے پپوٹے جو عموماً سرخی مائل رہتے تھے آج غیر معمولی طور پر سرخ لگ رہے تھے جیسے نیند پوری کرنے میں کوئی چیز مانع رہی ہے۔

اتنے میں جنرل ٹکا خان جہاز سے نکلے اور تقریباً اچھلتے ہوئے سیڑھیاں اتر آئے جیسے ٹینس بال باؤنس (Bounce) کرتا ہوا آتا ہے۔ صحت مند' توانا پر اعتماد! انہوں نے خوشی خوشی ہم سب سے مصافحہ کیا' ایک اچٹتی سی نگاہ ڈھاکہ ائر پورٹ پر ڈالی اور کار میں

بیٹھ کر مارشل لاء ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گئے۔

کوئی ایک گھنٹے کی بریفنگ جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کی صورت حال سے باخبر کیا گیا' میں اس برفنگ میں نہیں تھا' جونہی وہ فارغ ہو کر باہر نکلے تو سامنے برآمدے میں مجھے آتا دیکھ کر جنرل یعقوب رک گئے' چند قدم آگے بڑھے اور شفقت سے اپنا ہاتھ میرے دائیں کندھے پر رکھ کر فرمایا۔

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

جنرل ٹکا خان کا کام کرنے کا انداز خالص سپاہیانہ تھا جس کی ایک جھلک میں جی ایچ کیو میں دیکھ چکا تھا۔ وہ کام سے کام رکھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی نفاستوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے' مثلاً ڈھاکہ پہنچتے ہی انہیں سب سے پہلا مسئلہ یہ درپیش آیا کہ کوئی بھی جج گورنر مشرقی پاکستان کے طور پر ان سے حلف لینے کو تیار نہ تھا' انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''چھوڑو حلف ملف بعد میں ہوتا رہے گا' تم فاعل وائل میرے پاس بھیجو کچھ کام وام کریں۔''

یوں انہوں نے آتے ہی کام وام شروع کر دیا' فوج ان کا ویسے بھی احترام کرتی تھی۔ فوراً ان کے احکام بجالانے پر تیار ہو گئی البتہ سول بیوروکریسی ''میے دروں میے بروں'' کی کیفیت سے دوچار تھی بنگالی چیف سیکریٹری ان کے سامنے لیس سر' لیس سر' کرتا تھا اور واپس سیکرٹریٹ میں آ کر بنگالیوں سے گھل مل جاتا تھا۔ یہ دس بارہ سول انتظامیہ کے عدم تعاون کی وجہ سے خاصے مشکل تھے۔ انہی دنوں میں جنرل یحییٰ خان گتھی کو سلجھانے ڈھاکہ پہنچے کوئی ہفتہ بھر سیاسی مذاکرات ہوتے رہے' مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے رفقاء بھی آئے۔ یحییٰ' مجیب' بھٹو کی سہ رنگی ڈور میں پاکستان کی پتنگ الجھتی گئی' جنرل ٹکا خان اور ان کے ماتحت فوجی محو تماشائے لب بام رہے۔ حتیٰ کہ ۲۵ مارچ کا ناقابل فراموش دن آ پہنچا' جنرل یحییٰ اور دیگر سیاسی لیڈر مغربی پاکستان چلے آئے اور اسی رات جنرل ٹکا خان نے ڈھاکہ کی اینٹ سے اینٹ بجانا شروع کر دی۔ میں یہ خوفناک رات جنرل ٹکا خان اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ آنکھوں میں گزاری۔ میرے سامنے ڈھاکہ یونیورسٹی سے شعلے بلند ہوئے' میرے سامنے وائرلیس پر مزید طاقت استعمال کرنے کے آرڈر پاس ہوئے اور میرے سامنے شیخ مجیب الرحمٰن کو رات کے ایک بجے کے قریب سفید کرتے پاجامے میں گرفتار کر کے لایا گیا۔

جنرل ٹکا کان کی قوت فیصلہ اور اعتماد دیدنی تھا۔

جنرل ٹکا کان کا امیج پہلے بھی کچھ مصالحاتی نہ تھا آرمی ایکشن سے تو سراسر ڈراؤنا ہو گیا' لوگ ان کے قریب پھٹکنے سے ڈرتے تھے'

انہوں نے بنگالیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے مغربی پاکستان سے سول بیوروکریٹ منگوالئے' کچھ اضلاع میں تعینات کر دیئے اور کچھ سیکرٹریٹ میں سجالئے۔

ایک مہینے کے اندر اندر جنرل یعقوب کے دونوں فضا تلپٹ ہوگئی اور ہم خانہ جنگی کے مہیب دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

میرے ایما پر جنرل ٹکا خان نے بنگالی ایڈیٹروں سے ملنا شروع کیا' بنگالی ایڈیٹر خود ان سے خائف تھے لیکن میجر جنرل راؤ فرمان علی کے ہمدردانہ رویے کی وجہ سے ان کی ذرا ڈھارس بندھی اور میں نے بھی فرداً فرداً ہر کسی سے کہا کہ ''میں خود وہاں موجود ہونگا'' گویا اگر انہیں کسی نے ہڑپ کرنے کی کوشش کی تو میں انہیں بچالوں گا۔

یوں مدیروں سے ماہانہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

اب صاحبزادہ یعقوب کی لچھے دار انگریزی' عمدہ جملوں کی تراش خراش اور تشبیہات و استعارات سے مرصع گفتگو کا دور ختم ہو چکا تھا' اب رنگ چمن کچھ اس طور تھا (مدیروں سے جنرل ٹکا خان کی گفتگو کا ایک نمونہ)

''ہم کو جوٹ موٹ کی بڑی فکر ہے' رنگ پور' میمن سنگھ' کومیلا اور گولنڈو گھاٹ میں پڑی ہوئی جوٹ موٹ خراب ہو جائے گی' اس کا ایکسپورٹ کا بندوبست ہونا چاہیے' ہم نے بندوبست کیا' آرمی انجینیئرز کو لگایا کہ فیری میری کو چالو مالو کرو۔ ادھر جہاز مہاز کا بھی بندوبست کیا لیکن نہ تو تمہارا لیبر ویبر کام کرتا ہے اور نہ سیٹھ میٹھ آگے آتا ہے۔ پھر اخبار میں تم لکھتا ہے مشرقی پاکستان کا اکانومی وکانومی تباہ ہو گیا ہے''

ایک مرتبہ ہم نے ایک پریس پارٹی جیسور بھیجی تا کہ ہندوستان کی طرف سے کی گئی گولہ باری کا وہ خود مشاہدہ کر سکیں' میں خود اس پارٹی کے ساتھ نہ جا سکا کیونکہ سہ پہر کو جنرل صاحب نے ایک میٹنگ بلا رکھی تھی۔

میٹنگ غروب آفتاب سے ذرا پہلے ختم ہوئی اور انہوں نے مجھے پوچھا

''وہ پریس پارٹی کا کیا ہوا''

''صبح روانہ کر دی تھی' اب تو آنے والے ہوں گے''

''انہوں نے ادھر کچھ دیکھا ویکھا بھی یا نہیں''

''میں چیک اپ کرتا ہوں'' (داقع آفتاب کا پرانا نسخہ)

میں ان کے پیچھے پیچھے ان کے دفتر میں گیا۔ انہوں نے سٹاف سے کہا کہ مجھے جیسور ملاؤ۔ چند لمحوں میں کال مل گئی۔ انہوں نے

پوچھا۔ ”جی او سی ہے؟“

”وہ باہر گئے ہیں“

”بریگیڈ کمانڈر؟“

”وہ بھی ان کے ساتھ گئے ہیں“

”کوئی اور آفیسر ہے؟“ ”صاب‘ سب چھٹی ہو گیا“

”کوئی ہے بھی یا نہیں“

”جی ڈیوٹی کلرک ہے“

”اس سے بات کراؤ“

پھر انہوں نے ڈیوٹی کلرک سے پوچھا کہ پریس پارٹی کی کوئی خبر ہے‘ اس نے بتایا کہ اسے کوئی خبر نہیں‘ البتہ تھوڑی دیر پہلے اس نے چار پانچ ”چٹی چمڑی والے“ ہیلی کاپٹر میں بیٹھتے دیکھے تھے“

گڈ‘ گڈ

میری طرف دیکھ کر کہا وہ چل پڑے ہیں‘ جب پہنچ جائیں تو ان سے مل کر فرسٹ ہینڈ رپورٹ لینا اور مجھے ٹیلیفون پر اطلاع دینا“

ٹھیک ہے سر‘

میں نے آج تک اس طرح کام کرتے کسی جنرل کو نہیں دیکھا

لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی

جنرل نیازی‘ جنرل ٹکا خان کے ہوتے ہوئے ۱۰ اپریل ۱۹۷۱ کو ڈھاکہ پہنچے‘ اس وقت تک ڈھاکہ میں آرمی ایکشن مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ مشرقی پاکستان کے بعض دور افتادہ علاقوں میں ابھی چنگاریاں سلگ رہی تھی۔ جنرل نیازی کی آمد نے ان چنگاریوں کو ٹھنڈا کرنے کی بجائے مزید بھڑکایا‘ ۲ ستمبر کو جنرل ٹکا خان کی سبکدوشی کے بعد وہ عملاً مشرقی پاکستان کے مختار کل بن گئے (کیونکہ گورنر اے ایم مالک کی حیثیت ایک عضو معطل سے زیادہ نہ تھی) اور ۱۹۷۱ء کی یہ آخری سہ ماہی ہی تھی جس میں خانہ جنگی نے خانہ بربادی کی صورت اختیار کی اور اس دور کی قیادت کا طوق جنرل نیازی کی گردن میں تھا۔

۱۰ اپریل سے ۱۶ دسمبر تک وہ میرے پاس رہے اور اس عرصے میں اس سپہ سالار پاکستان کی شخصیت کے کئی پہلو دیکھنے میں

آئے' ایک تو انہوں نے ایڈیٹروں سے ماہانہ ملاقات کا سلسلہ ختم کر دیا اور صرف اپنی پسند کی غیر ملکی لیڈی رپوٹرز کو اپنی رہائش گاہ پر خصوصی انٹرویو دینے لگے۔ دوسرے انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کو احساس تحفظ دینے کی بجائے ڈھاکہ شہر کے چند خاندانوں تک اپنی سرپرستی محدود کر دی اور کئی لوگوں نے انہیں کئی بار چھوٹی گاڑی میں بیٹھ کر رات کے وقت شہر کی طرف جاتے اور رعایا کے چیدہ چیدہ افراد کی سرپرستی کرتے دیکھا' یہ گن صاحبزادہ یعقوب میں تھا نہ جنرل ٹکا خان میں۔

ڈھاکہ شہر کے باہر وہ اکثر چھاؤنیوں کا دورہ کرتے رہتے تھے' ان دوروں میں وہ افسروں اور سپاہیوں سے فوراً گھل مل جاتے تھے۔ کبھی ان کے ساتھ چکن تکہ کھا کر اور کبھی انہیں فحش لطیفے سنا کر' ایسے دوروں میں ان کا تکیہ کلام ہوتا تھا'' شیرا' ہور دس کتنے کافر مارے فی'' پھر وہ دوسرے سپاہی کی طرف رخ کرتے اور اس سے بھی یہی سوال پوچھتے اور تسلی بخش جواب پا کر کہتے؟

''شاباش' پترا' شاباش' دبائی رکھ''

ان دوروں پر وہ عسکری امور پر بھی توجہ دیتے۔ خاص کر مورچوں کے ڈیزائن اور لائٹ مشین گن کے ریجن آف فائر پر تنقیدی نگاہ ڈالتے (جو در حقیقت ایک حوالدار کا کام ہوتا ہے) ایک جگہ انہیں غلط مورچہ نظر آیا تو متعلقہ میجر کو خوب جھاڑ پلائی' انسپکشن کے بعد ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچے تو مشروبات اور دیگر لوازمات دیکھ کر ذرا ٹھنڈے پڑے۔ خوب کھاتے پیتے رہے۔ مجھے کوکا کولا پیتے دیکھ کر کہنے لگے'' دیکھ سالا' عیش کر ہمارے ساتھ' کیا یاد کرے گا تو' کالج میں پروفیسری کرتا رہتا تو یہ بھلے کیسے لوٹتا۔ پھر انہوں نے معتوب میجر کی طرف نظر عنایت کی اور پوچھا۔

''اوئے مجیدے' توں کتھے پڑھدا رہیا ایں''

(تم کہاں پڑھتے رہے ہوں)

''جی سر میں سالک صاحب کا شاگرد ہوں' یہ فیصل آباد میں میرے استاد رہے ہیں۔

''تبھی تمہارے مورچے خراب ہیں''

پھر میری طرف مڑے

''کیوں پروفیسرا' کوئی ہور وی ترے شاگرد ادھر ہیں''

(کیا تمہارے اور بھی شاگرد ادھر ہیں۔)

''جی ہاں' جہاں کہیں آپ کو کوئی غلط مورچہ نظر آئے سمجھ لیجئے' میرے شاگرد کا ہے کیونکہ میں چار پانچ سال انگریزی پڑھاتا رہا

ہوں''

اس لذت کام و دہن کے بعد وہ چھڑی کے سہارے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''چل شیرا چلئے''

ڈھاکہ چھاؤنی میں میرے معمول کے فرائض کے علاوہ مجھے یہ ڈیوٹی بھی سونپی نہ گئی کہ علی الصبح جب ایک کرنل صاحب آپریشن روم میں جنرل نیازی اور ان کے سینئر رفقا کو جنگی یا خانہ جنگی کی صورت حال پیش کیا کریں گے اور دوسرے کرنل صاحب انٹیلی جینس پکچر دیا کریں گے تو میں ملکی اور غیر ملکی اخبارات اور نشری اداروں کی رپورٹوں کا خلاصہ پیش کیا کروں گا۔ میں نے بھی تعمیل ارشاد شروع کر دی۔

میری معروضات کا تانا بانا کچھ اس قسم کا ہوتا تھا۔

بی بی سی کے مطابق پاکستانی فوجیوں نے چھ نہتے بنگالیوں کو شوٹ کر دیا اور دو بنگالی عورتوں کی آبروریزی کی۔ ڈیلی ٹیلی گراف لندن کا کہنا ہے کہ بنگال میں پاکستانی فوج کا مورال خاصا پست ہے کیوں کہ اسے اندر اور باہر دونوں طرف سے دشمن کا سامنا ہے جب کہ نیویارک ٹائمز کے نمائندے نے کلکتہ سے خبر دی ہے کہ مکتی باہنی کے مزید آٹھ ہزار افراد اپنی تربیت مکمل کر چکے ہیں اور وہ اگلے مہینے مشرقی پاکستان کے اندر اپنی کارروائیاں شروع کر دیں گے''

ایک دن حسب معمول میں نے اپنی بریفنگ کا آغاز کیا تو جنرل نیازی نے مجھے ٹوکا اور کہا۔

''ٹھہرو! ایک تو انگریزی بولنے والے ہمیں لے بیٹھے ہیں۔ ایک انگریزی بولنے والا (صاحبزادہ یعقوب) تو انگریزی بول بول کر ہمارا ستیاناس کر گیا ہے اب یہ (یعنی میں) روز ہمارے کان کھاتا ہے' پہلے یہ بتاؤ کہ لفٹل ہارٹ تو کیپٹن ریٹائر ہو گیا تھا' تمہیں میجر کس نے بنایا''

عرض کیا

''یہ واقعہ آپ کے آنے سے پہلے رونما ہو گیا تھا''

وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر کہنے لگے مزید انگریزی بولنے سے پہلے ایک لطیفہ سنو۔

''ماہ رمضان کی آمد پر ایک گاؤں کے مولوی صاحب نے گاؤں والوں کو اکٹھا کیا اور کہا اے ایمان والو! مبارک ہو' ماہ رمضان کا چاند نظر آ گیا ہے۔ یہ عبادات' برکات اور صدقات کا مہینہ ہے۔۔۔۔ وہ یہ وعظ کر ہی رہا تھا کہ اتنے میں گاؤں کا ایک بڈھا اٹھا اور کہنے لگا' مولوی صاحب تم نے تو وطیرہ میں بنا لیا ہے' آج رمضان کا رعب دے کے عبادت کی تلقین کر رہے ہو' کل عید الفطر کے

فطرانے کی بات کرو گے' دو ماہ بعد بقر عید پر قربانی کی ترغیب دو گے۔ کبھی کوئی خیر کی خبر بھی سنا دیا کرو'

لطیفہ سنانے کے بعد وہ سب سے زیادہ خود ہنسے اور مجھے فرمانے لگے

''تو بھی مولوی کی طرح روز پریشان کن خبریں لاتا ہے کہ بی بی سی نے یہ کہہ دیا' لنڈن ٹائمز نے یہ لکھا' فلاں نے یہ تبصرہ کر دیا۔ کبھی کوئی خیر کی خبر بھی سنا!''

عرض کیا ''وہ بھی ہے''

تو پہلے وہ سناؤ'

عرض کیا

''افریکہ میں ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا پرانا نام Dahomey ہے۔ اب اسے Benin کہتے ہیں۔ اس کے جنوبی حصے سے ایک اخبار نکلتا ہے جس کا نام ہے بیناٹن ٹائمز' اس کی حالیہ اشاعت میں لکھا ہے کہ فوجی حکومتیں عموماً نظم و نسق برقرار رکھنے پر زیادہ توجہ دیتی ہیں جیسا کہ آج کل پاکستان کی فوج اپنے مشرقی حصے میں کر رہی۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ جنوبی امریکہ کے سنگم پر Somoza Dynasty کا ایک ہفتہ روزہ جریدہ نکلتا ہے جس میں براہ راست ایسٹرن کمانڈ کا تو کوئی ذکر نہیں البتہ فوجی حکومتوں کی حمایت میں کچھ کلمات خیر لکھے ہیں۔۔۔

انہوں نے حکم دیا

''ہاں ایسی مثبت رپورٹوں کو ہائی لائٹ کیا کرو'

''ٹھیک ہے' سر''

یوں وہ دسمبر ۱۹۷۱ تک حکم دیتے رہے' ہم ''ٹھیک ہے' سر'' کہتے رہے اور بالآخر خانہ بربادی اور جگ ہنسائی کی منزل کو پہنچ گئے۔

◆◆◆

فلیگ سٹاف ہاؤس، ڈھاکہ

آیئے ڈھاکہ سے آخری مرتبہ رخصت ہونے سے پہلے ایک نظر فلیگ سٹاف ہاؤس پر ڈالتے چلیں جو مسرقی پاکستان کے عسکری کی کمانداراعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ تھا۔ ایک عرصے سے یہیں سے طوفان اٹھتے رہے اور بہت سے طوفانوں کو کچلنے کے لئے یہیں سے اقدامات کئے جاتے رہے۔ کبھی اس کی اوٹ سے شام غریباں نازل ہوتی رہی۔ کبھی اس کی آڑ میں سیاسی شطرنج سجائی جاتی رہی اور کبھی اس کی آہٹ سے بنگالی دبکتے اور سسکتے رہے۔ یہ محض سنگ وخشت کی عمارت نہ تھی' یہ مشرقی پاکستان کے سنورنے اور بگڑنے کی عینی شہادت تھی۔ میری اس سے چار یاداشتیں وابستہ ہیں ایک جنرل یحییٰ خان کی نسبت سے اور تین جنرل یعقوب' جنرل ٹکا خان اور جنرل نیازی کے حوالے سے!

جنرل یحییٰ خان' خود جی او سی کے طور پر اس گھر میں چند سال گزار چکے تھے لیکن میری یاداشت کا حوالہ ان کا قیام نہیں ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ کو وہاں سے روانگی ہے۔ یہ وہ ہے جو شکست پاکستان اور قیام بنگلہ دیش کے حوالے سے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس شام مسرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کا حکم دینے کے بعد جنرل یحییٰ خان ہمیشہ کے لئے مغربی پاکستان چلے آئے تھے اور وہ بھی ایسے رازدارانہ انداز میں جیسے کوئی تخریب کار کسی عظیم الشان عمارت میں ڈائنامائٹ رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔

شہر میں پچھلے تین ہفتے سے فضا خاصی کشیدہ تھی۔ کوئی دس روز پہلے وہاں سیاسی مذاکرات شروع ہوئے تھے۔ لوگ لمحے لمحے کی خبر رکھ رہے تھے۔ وہ بھی جو پاکستان کو متحد دیکھنا اور ماضی سے رشتہ قائم رکھنا چاہتے تھے اور وہ بھی جو اس کی راکھ سے صبح نو کی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے۔ مذاکرات کا اصل مرکز تو شہر میں واقع پریذیڈنٹ ہاؤس (کیمپ آفس) تھا لیکن لوگوں کی نظریں فلیگ سٹاف ہاؤس پر لگی تھیں' بنگالی "شرپسند" یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ یحییٰ خان کے جرنیل فلیگ سٹاف ہاؤس میں بیٹھے ان کی سرکوبی کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور شہر میں مذاکرات کا ٹنٹا محض مزید وقت حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے حالانکہ حقیقت حال یہ تھی کہ فوجی قیادت کا اولین ترجیح سیاسی مذاکرات کی کامیابی تھی اور صرف ناکامی کی صورت میں فوجی کاروائی کا راستہ اپنایا جاسکتا تھا' کیونکہ بحران اندرونی ہو یا بیرونی' فوقیت ہمیشہ مذاکرات کو حاصل ہوتی ہے اور جب زبان کے ہتھیار کارگر نہ ہوں تو پھر ہتھیاروں کی زبان استعمال کی جاتی ہے' معکوس صورت ناقابل فہم ہے۔

۲۵ مارچ کی سہ پہر جنرل یحیٰی خان شہر سے چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے اور فلیگ سٹاف ہاؤس پہنچے' وہ پورے کروفر اور شان و شوکت سے وہاں آئے تا کہ بنگالیوں کو پتہ چل جائے کہ وہ چھاؤنی میں گئے ہیں' کوئی دو گھنٹے کے بعد ان کا پورا قافلہ۔۔۔صدر مملکت کی ڈنڈے اور جھنڈے والی کار' آؤٹ رائیڈرز' ایڈوانس پائلٹ' سیکورٹی کا عملہ۔۔۔۔سرشام چھاؤنی سے شہر چلا گیا تا کہ بنگالیوں کو باور ہو جائے کہ وہ واپس گورنر ہاؤس یا پریذیڈنٹ ہاؤس آ گئے ہیں۔لیکن اس قافلے میں جنرل یحیٰی خان نہیں تھے۔ان کی جگہ انہی کے چوکھٹے کے ایک بریگیڈئر صاحب لال بینڈ والی پی کیپ پہنے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ اے ڈی سی کی جگہ ایک اور افسر براجمان تھے۔

جب سورج اچھی طرح ڈوب چکا اور ڈھاکہ پر سیاہی پوری طرح چھا گئی تو جنرل یحیٰی خان ایک چھوٹی سی فوکس ویگن میں بیٹھ کر فلیگ سٹاف ہاؤس سے نکلے' چپکے چپکے پی اے ایف بیس کے راستے جہاز پر بیٹھے اور کراچی روانہ ہو گئے' پیاسوں کے لبوں میں کوثر و تسنیم کا پیالہ رکھنے والے سب کے دلوں میں زہر ہلاہل گھول کر چلے گئے۔اس رات پاکستان کی عظیم الشان عمارت میں رکھا ہوا ڈائنا مائٹ پھٹ پڑا اور قومی وحدت کے سارے سر بکھر گئے' پھر بھی کسی کو دعویٰ تھا کہ ''شکر ہے پاکستان بچ گیا'' یا اللہ یہ شمع راہنما ہے یا مرغ بادنما!''

فلیگ سٹاف ہاؤس سے وابستہ میری دوسری یادداشت نسبتاً خوشگوار ہے۔یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ابھی درخت سے سایہ جدا نہیں ہوا تھا اور صاحبزادہ یعقوب اس گھر میں بیٹھے بنگالیوں کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کر رہے تھے' میں ان کے سٹاف آفیسر کے طور پر ان سے ایک پریس نوٹ کی منظوری لینے گیا تھا۔میرے پہنچتے ہی ایک ملازم نے مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔جب تک وہ تشریف لاتے' میں کمرے کی زیب و زینت کا جائزہ لیتا رہا۔کمرہ ان کی شخصیت کا عمدہ عکس تھا۔وال ٹو وال کارپٹ' کارپٹ پر عمدہ ایرانی قالینوں کے دو ٹکڑے' فرش سے ہم آہنگ فرنیچر اور فرنیچر کے ہم رنگ پردے' دیواروں پر پینٹنگ اور کونوں میں ٹیبل لیمپ اور نادر زیبائشی اشیاء!

اتنے میں جنرل صاحب تشریف لائے' سلیپنگ سوٹ پر چائنا شنگھائی کا پھولدار گاؤن' گاؤن کے نیچے ٹخنوں کے قریب پاجامے کی منڈیر' اس سے نیچے صاف سفید پاؤں اور پاؤں پر ہلکے سے چپل' وہ چپل جو باتھ روم میں نہیں صرف بیڈروم یا ڈرائنگ روم میں پہنے جاتے ہیں۔وہ گاؤن کی خوبصورت ڈوری سہلاتے ہوئے میری طرف بڑھے' گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور صوفے پر بیٹھ گئے۔چائے کا پوچھا اور معذرت کا سن کر پریس نوٹ کا مسودہ دیکھنے لگے' ایک موقع پر مجھ سے قلم مانگا میں نے سوچا لو اہل زبان اور

صاحب زبان کے ہتھے چڑھ گئے اب میری انگریزی کے اڑیں گے پرزے' میں نے بیتابی سے بطخ کی طرح گردن پھیلا کر کاغذ کی طرف دیکھا کہ کہاں زد پڑتی ہے' انہوں نے میرا سیمی کولن کاٹ کر فل سٹاپ لگا دیا اور اگلے لفظ کا پہلا حرف بڑا (Capital) کر دیا۔

میں تصحیح شدہ پریس نوٹ لے کر واپس آ گیا اور اخبارات کو جاری کر دیا۔ مجھے تیسری مرتبہ اس گھر میں جانے کا اس وقت اتفاق ہوا جب جنرل ٹکا خاں وہاں رہ رہے تھے۔ مجھے حکم ملا کہ ملکی اور غیر ملکی اخباروں کے تراشے لے کر فلیگ سٹاف ہاؤس پہنچ جاؤں' میں پہنچ گیا۔ فوجی وضع قطع کے ایک شخص نے مجھے ڈرائنگ میں بٹھا دیا۔ یہ وہی ڈرائنگ روم تھا جس میں' میں صاحبزادہ یعقوب کے وقت کچھ لمحات گزار چکا تھا۔ اب اس کمرے کا وہی حال ہو چکا تھا جو آرمی ایکشن کے بعد مشرقی پاکستان کا ہوا تھا یعنی سراسر یاس اور پژمردگی! قالین پردے پینٹنگ اور زیبائش چیزیں غائب ہو چکی تھیں صرف ایم۔ ای۔ ایس کا سرکاری صوفہ اور بیڈ کی تین کرسیاں رکھی تھیں' دیواروں سے تصویریں غائب تھیں' البتہ ان کے کیل ہنوز موجود تھے بلکہ دیوار پر وہ نشان بھی موجود تھے جہاں پہلے پینٹنگ لٹکی ہوئی تھیں یعنی وہ جگہ باقی دیوار کی نسبت صاف تھی۔

اتنے میں وہی فوجی بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا جنرل صاحب پورچ کی طرف چلے گئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں' میں اخباری تراشوں کی دونوں فائلیں بغل میں دبائے ان کی طرف بھاگا' انہوں نے گاڑی کی اگلی سیٹ پر بٹھا لیا اور پیچھے ان کے بیٹے نے جگہ سنبھالی جوان کے اے ڈی سی کا کام کر رہا تھا' اتنے میں ان کا اردلی بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا۔

''صاحب جی' شام کو کیا پکانا ہے''

بیٹے نے باپ کی طرف دیکھا' باپ نے کہا

''اج ساڈی روٹی باراے'' وہ مطمئن ہو کر واپس چلا گیا گاڑی فراٹے بھرتی گورنر ہاؤس روانہ ہو گئی۔

میری چوتھی یادداشت جنرل نیازی کے حوالے سے ہے وہ تازہ تازہ ڈھاکہ پہنچے تھے اور فلیگ سٹاف ہاؤس میں براجمان تھے۔ مجھے ان کے اے ڈی سی کا پیغام ملا کہ سہ پہر کو ایک فوٹو گرافر لے کر ان کے گھر پہنچ جاؤں جنرل صاحب نئے رینگ میں تصویر کھنچوانا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ان کی تازہ اور پسندیدہ تصویر ہی اخبارات کو جاری کی جائے۔

میں ایک کی بجائے دو فوٹو گرافر لے گیا تا کہ اگر ایک سے بھول چوک ہو جائے تو دوسرا کمی پوری کر لے۔ ہمیں اردلی نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا جو ڈرائنگ روم کم اور مسافر خانہ زیادہ لگ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر مکاں اور مکیں کے باہمی رشتے کا قائل

ہو گیا۔

ہم تینوں ڈرائنگ روم یا ویٹنگ روم میں بیٹھے بیٹھے سوکھ گئے لیکن کسی نے پانی پوچھا نہ جنرل صاحب نمودار ہوئے۔ مجھے پتہ تھا کہ جنرل صاحب فیملی کے بغیر ڈھاکہ میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں لہذا میں اکتا کر اپنی سیٹ سے اٹھا اور لاؤنج سے اندر کی طرف جھانکا' کیا دیکھتا ہوں کہ جنرل صاحب زنانہ قسم کے سنگار میز کے سامنے بیٹھے خواتین کی آئی برو پنسل (Eye Brow Pencil) سے مصنوعی مونچھیں بنا رہے ہیں۔ ایک مونچھ بناتے ہیں تو دوسری چھوٹی رہ جاتی ہے' رومال کو تھوک لگا کر لمبی مونچھ کو چھوٹا کرتے ہیں تو وہ ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہو جاتی ہے۔ مجھے غالب کا یہ مصرعہ یاد آیا۔

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

میں نے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بنگالی فوٹو گرافروں کو بتایا کہ صبر سے بیٹھے رہیں کیونکہ مشرقی پاکستان کے کماندار اعلیٰ اس وقت دفاع مشرقی پاکستان کی اسٹریجی کو آخری شکل دے رہے ہیں' انہوں نے تقریباً ایک زبان ہو کر کہا ''جیسا آپ کا آرڈر' شالک صاحب''

ہم پھر انتظار کی گھڑیاں گننے لگے اور میں چشم تصور سے دیکھتا رہا کہ اب بائیں مونچھ بچھو کے ڈنگ کی طرح زیادہ اٹھ گئی ہو گی اور اب دائیں مونچھ بھیگی ہوئی موم بتی کی طرح بجھ چکی ہو گی' اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ٹائیگر اپنے کچھار سے باہر آ گیا ہے۔ نئی کلف وردی پر لیفٹیننٹ جنرل کا دمکتا ہوا رینگ' تیز بلیڈ سے کیا ہوا تازہ شیو' شیو پر کریم اور پاؤڈر کی دبیز تہہ جو بھوؤں پر زیادہ نمایاں لگتی تھی اور بھوؤں سے نیچے اور ہونٹوں سے اوپر محنت سے بنائی مصنوعی مونچھیں جو کناروں پر پہنچ کر اوپر کو اٹھ گئی تھیں' بڑی بہار دکھا رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا

''شیر اتیار ایں؟''

''جی' تشریف لایئے''

وہ ایک سٹول پر بیٹھ گئے' کبھی ایک پہلو پر' کبھی دوسرے پہلو پر کبھی ایک پوز میں' کبھی دوسرے پوز میں' ہر پوز اور ہر پہلو پر بیٹھ کر وہ دستی شیشے کی مدد سے اپنے رینگ اور مونچھوں کو بغور دیکھتے اور جب اطمینان ہو جاتا تو فوٹو گرافر سے کہتے۔

''شیر' ہن کھچ''

بنگالی فوٹو گرافر پنجابی سمجھے بغیر ہی حکم بجا لاتے

ہم تصویریں بنا کر چلے آئے

وہ ان جھوٹی مونچھوں کے سہارے' اگلے آٹھ ماہ تک' ہمیں جھوٹی تسلیاں دیتے رہے اور کہتے رہے کہ اگر بھارت نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے کی حماقت کی تو میں آپ کو کلکتہ لے جاؤنگا' دسمبر ۱۹۷۱ میں بھارت نے یہ حماقت کر ڈالی اور جنرل نیازی ہمیں کلکتہ لے گئے۔ فاتح کے طور پر نہیں جنگی قیدی کی حیثیت سے (اگر جنگی قیدی کی کوئی حیثیت ہوتی ہے تو)

◆◆◆

بھارت کے بندی خانے

جی ایچ کیو نے دو سال کے لئے میری پوسٹنگ مشرقی پاکستان کی تھی' جنرل نیازی دسمبر ۱۹۷۱ میں اپنی ای آرای پر مجھے دو سال کے لئے ہندوستان لے گئے۔ ہماری پہلی منزل کلکتہ تھی' جس کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن اسے دیکھا کبھی نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر بھی یہ حسرت پوری نہ ہو سکی کیونکہ قیدی اور سیاح میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ قیدی صرف وہ کچھ دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ کلکتہ کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے صرف اس کی دھند' گندگی اور دریائے ہگلی نظر آیا' پھر قہر ذلت میں ایسے گرے کہ کچھ ہوش نہ رہا۔

فورٹ ولیم کی ایک بیرک میں ہم محبوس تھے۔ جس کی بالکنی چھاؤنی کی رہائشی آبادی کی طرف کھلتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کمرے میں لیٹے لیٹے تنگ آگیا تو سہ پہر کو بالکنی میں آکھڑا ہوا' دو تین سو گز دور ایک سکھ' اپنی پتنی اور بیٹے کو لے کر بازار جا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا اور انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے انہیں کچھ سمجھانے لگا' میں سمجھا مجھ پر انگلی اٹھا رہا ہے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ لوگ قیدیوں پر خواہ وہ مجرم ہو یا ملزم' انگلیاں اٹھایا ہی کرتے ہیں' مجھے اپنی عزت نفس کے آبگینے چکنا چور ہوتے سنائی دیئے' قومی حمیت کا جنازہ تو ۱۶ دسمبر کو ہی اٹھ چکا تھا۔

فورٹ ولیم کلکتہ میں قیام کے دوران بھارتی آقاؤں کا رویہ گوارا رہا' ابھی بارش سنگ شروع نہیں ہوئی تھی' غالباً وہ تا حال ہمارے انتظامات میں مصروف تھے' لیکن ہمیں ہماری فراغت کاٹ کھانے کو آتی تھی کیونکہ جتنی فرصت اتنے ہی زیادہ خیالات اتنے ہی زیادہ سنگ ریزے دل میں کرچتے تھے۔

اس عرصے میں جنرل نیازی روزانہ ایک گاڑی میں بیٹھ کر بھارتی جرنیلوں کے پاس چلے جاتے تھے' ایسی ملاقاتوں کو سرکاری زبان میں تو Interrogation کہتے ہیں' لیکن جنرل نیازی اپنا طرہ بلند رکھنے کے لئے اسے Discussion کا نام دیتے تھے' بعد میں ہم نے بھارتی اخبارات اور کتابوں میں پڑھا کہ ان ملاقاتوں میں وہ بھارتی جرنیلوں کو گندے لطیفے سناتے تھے' اور اپنی جنگی کارکردگی پر ان سے داد طلب کرتے تھے۔

مجھے جنرل نیازی اور ان کے وی آئی پی گروپ کے ساتھ فورٹ ولیم میں تین ہفتے گزارنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد وہی ہوا جو

ہونا چاہیے تھا۔ ہماری راہیں الگ الگ ہوگئیں۔ وہ جبل پور تشریف لے گئے اور مجھے کلکتہ چھاؤنی کے ایک Interrogation Cell میں زیر زمین قید کردیا گیا۔ تین ماہ کی یہ قید تنہائی اذیت اور ذلت کے لحاظ سے دو سالہ قید کا نچوڑ تھی' قید کے بعد جب پاکستان میں سید ضمیر جعفری کے ہاں فیض احمد فیض صاحب کے ساتھ ملاقات ہوئی تو انہوں نے ساری روداد سن کر فرمایا۔ ''تو یوں کہیئے نا'' اصل قید تو تین ماہ ہی تھی۔ پھر انہوں نے اپنی قید تنہائی کا حال سناتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ تڑکے تڑکے انہیں سنٹرل جیل منٹگمری (ساہیوال) کی قید تنہائی سے نکال کر ایک جیپ میں ڈالا گیا اور سخت حفاظتی انتظامات میں لاہور قلعے پہنچایا گیا جو اذیت کا مرکز سمجھا جاتا تھا' بقول فیض صاحب وہ سارا راستہ سوچتے رہے کہ پتہ نہیں اب قلعہ کی دیواروں کے پیچھے لے جا کر وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے لیکن انہیں سیل میں پہنچانے کے بعد جو پہلا شخص آیا۔ اس نے کہا ''فیض صاحب آپ ناشتہ میں انڈہ فرائی لیتے ہیں یا آملیٹ''

مجھے بھی فورٹ ولیم سے قید تنہائی کے سیل تک پہنچانے میں تین گھنٹے تک آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھمایا گیا (تاکہ مجھے وقت اور جگہ کا شعور نہ رہے) لیکن منزل پر پہنچ کر کسی نے نہ پوچھا کہ ''میاں ناشتے میں کیا لوگے''۔ وہاں تو گالی گلوچ' مار پیٹ' بھوک پیاس اور رسوائی و ذلت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے جو عرصہ وہاں گزارا۔ اللہ تعالیٰ دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ایک مہینے میں میرا وزن پچاس پونڈ کم ہو گیا' شیو اور غسل کی سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے پورے جسم پر خارش ہوگئی۔ ناک داڑھی اور مونچھوں کے بال آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور میل کی تہوں پر کھجلی کر کے سارا جسم پھوڑے کی طرح پک گیا۔

مجھے اس بھارتی خاکروب پر رشک آنے لگا جو آزادانہ وہاں آتا تھا اور دالان میں جھاڑو دینے کے بہانے خاک اڑا کر چلا جاتا تھا جب کہ مجھے دالان میں بکھری ہوئی سردیوں کی دھوپ دیکھنا بھی نصیب نہ تھی۔ مجھ سے بہتر وہ چڑیا تھی جو مرضی سے میری کوٹھڑی کی یاس انگیز منڈیر پر آ بیٹھتی تھی اور تازہ ہوا میں چند لمحے چہچہا کر چڑیوں کے غول میں جا شامل ہوتی تھی۔ میں تو اپنے غول سے بھی کٹا ہوا تھا اور اپنے ماحول سے بھی! مجھے تو ہر پندرہ دن کے بعد ایک غلیظ اور بدزبان محتسب (Interrogator) سے واسطہ پڑتا تھا جو طرح طرح کی اذیتیں دے کر مجھے توڑنے (Break) کرنے کے درپے تھا' اس کے حربوں سے میں بجھ تو ضرور گیا تھا لیکن ٹوٹا ہرگز نہیں تھا۔

ہم مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اثاثہ ہمارا ایمان ہے۔ جو ایسے وقت میں سہارا بنتا ہے جب دوسرے تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تاریک' خاموش اور خنک رات کو جب تین چار مسٹنڈے ہنٹر لے کر سیل میں آتے اور ایک ایک قیدی کی قوت برداشت کا امتحان لیتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلعم ہماری ڈھال بن جاتے۔ میں سوچتا ہوں اگر مجھ جیسے گنہگار کے لئے ایمان اتنا بڑا سہارا

بن سکتا ہے تو اللہ کے نیک بندوں کا کیا عالم ہوگا۔ وہ تو پہاڑوں سے ٹکرانے کی اہلیت رکھتے ہوں گے (اور تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو پہاڑوں سے زیادہ مضبوط سمجھنے والے فرعونوں کے ساتھ ٹکر لی ہے۔)

خدا خدا کر کے قید تنہائی کا دور ختم ہوا تو مجھے سنٹرل جیل آگرہ منتقل کر دیا گیا' جہاں چار کیمپوں میں ہزاروں پاکستانی افسر اور سپاہی قید تھے' مجھے اسی جیل کے ایک گوشے میں واقع کیمپ ۴۴ میں بھیج دیا گیا۔ جس میں ۱۹۰ افسر محبوس تھے' قید تنہائی سے نکل کر بازار میں آ گیا ہوں۔ یہاں دالان میں بچھی ہوئی دھوپ دیکھنے پر پابندی ہے نہ منڈیر پر چہکنے والی چڑیا سے باتیں کرنے پر قدغن' بلکہ یہاں تو تقریباً دو سو نفوس بستے ہیں' جن سے کسی بھی وقت شرف ہمکلامی کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مجھے کئی پرانے دوست ملے اور کئی نئے چہرے! پرانے لوگوں سے دوستی مزید مستحکم ہوئی اور نئے چہروں کے ساتھ مستقبل کے رشتے استوار ہوئے' ان نئے اور پرانے جلیسوں میں میرا بار غم یوں بانٹا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں بھارت کی قید میں نہیں' چھوٹے سے پاکستان میں ہوں' جہاں میرے ہم وطن اور میرے ہم نفس میرے دست و بازو ہیں' اب مجھے کوئی زک نہیں پہنچا سکتا' اب مجھے کوئی محتسب (Interrogator) تختہ دار پر لٹکانے کی دھمکی نہیں دے سکتا' حالانکہ ہم سب بے بس تھے۔ لیکن بعض اوقات بے بس انسان بھی ڈھارس کا کتنا بڑا سبب بن جاتے ہیں۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے جنرل ضیاء الحق کی بطور چیف آف آرمی سٹاف تقرری کا ذکر کیا تھا۔ یہ فروری ۱۹۷۶ کا واقعہ ہے' انہیں یکم مارچ ۱۹۷۶ کو چارج لینا تھا' ان دنوں کوئی ایک ماہ پہلے نئے جانشین کی تقرری کا اعلان ہو جاتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا تھا کہ آنے والا اپنی سوچ کو آخری شکل دے سکتا تھا اور جانے والا عزت و آبرو کے ساتھ۔۔۔ مختلف چھاؤنیوں کے الوداعی دورے کر کے۔۔۔ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو سکتا تھا۔

انہی دنوں سبکدوش ہونے والے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ٹکا خان الوداعی دورے پر نکلے اور مجھے ان دوروں کی کوریج کے لئے نامزد کیا گیا' وہ ملتان تشریف لے جا رہے تھے' میں ان سے پہلے وہاں پہنچ گیا' ان کی آمد کے موقع پر ہم سب ملتان ائرپورٹ پر کھڑے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا اور ہم سب نے جرسی پہنی ہوئی تھی' جنرل ضیاء الحق سب سے آگے تھے اور میں سب سے پیچھے۔ انہوں نے جیبی گھڑی جرسی کی جیب سے نکالی' وقت دیکھا۔ جنرل ٹکا خان کی آمد میں ابھی چند منٹ باقی تھے' انہوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا' میں اشارہ پاتے ہی آگے بڑھا' انہوں نے فرمایا' آپ کی پہلی کتاب پر تو آپ سے بات ہو چکی ہے' اس سے آگے لکھائی پڑھائی کا کیا عالم ہے؟'' عرض کیا'' جاری ہے' سقوط ڈھاکہ کا آنکھوں دیکھا حال''Witness to surrender'' کے نام

سے رقم کر چکا ہوں' آجکل کلیرنس کے مراحل سے گزر رہا ہوں' اجازت ملتے ہی شائع ہو جائے گی۔''

انہوں نے فرمایا۔

''میں آزادی تحریر و تقریر کا قائل ہوں' آپ کو یہ کتاب شائع کرنے کی اجازت ضرور ملے گی۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ کہ آپ کی انگریزی کی کتاب کیسی ہے' لیکن اردو کی کتاب تو بہت اچھی تھی' میں روالپنڈی آتے ہی آپ کو اپنا سپیچ رائٹر (Speech Writer) مقرر کر دوں گا۔''

میں اسے ایک بے ضرر سا جملہ سمجھا جو اکثر سینئر افسر جونیئر کی حوصلہ افزائی کے لئے کہہ دیتے ہیں' اس کے بعد وہ راولپنڈی آ ئے۔ کوئی سوا سال تک خالص چیف آف آرمی سٹاف رہے لیکن انہوں نے مجھے اپنا سپیچ رائٹر مقرر نہ کیا' حتیٰ کہ ۶ جولائی ۱۹۷۷ کو وہ جب چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر بنے اور مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ فروری ۱۹۷۶ میں ان کے ذہن میں کوئی ایسی بات تھی' جس کی وجہ سے مجھے یہ ذمہ داری سونپنے کا انہیں خیال آیا اور سولہ مہینے بعد اسے عملی شکل دی۔

اس سے ڈیڑھ سال پہلے ان کو جب میں نے فوج سے رہائی کا واسطہ دیا تھا' تو انہوں نے ایسا ہی ایک بے ضرر سا جملہ کہہ دیا تھا کہ سال ڈیڑھ سال تک رک جاؤ' ممکن ہے اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل آئے۔

لیکن یہ تو بعد کی باتیں ہیں' میں تو فروری ۱۹۷۶ کی بات کر رہا تھا جب جنرل ٹکا خان اپنے الوداعی دورے پر ملتان تشریف لائے تھے' انہوں نے وہاں گیریژن دربار سے خطاب فرمایا' جس کی رپورٹنگ مجھے کرنا تھی۔ انہوں نے حسب موقع فوج کی تعریف کی اور بطور چیف آف آرمی سٹاف اپنی کارکردگی پر روشنی ڈالی' انہوں نے من جملہ دیگر باتوں کے' فرمایا۔

''ہم نے چار سالوں میں فوج کے لئے بہت کام وام کیا' اس کی نفری وفری بڑھائی' نفری کی تنخواہ بھی بڑھائی کیونکہ مہنگائی ونگائی بہت ہو گئی تھی' ہم نے گورنمنٹ کو بولا۔ سپاہی کا گزارہ مشکل ہوتا ہے' گورنمنٹ نے الاؤنس ماؤنس منظور کیا۔ پھر پنشن وینشن میں بھی کچھ فرق پڑا' البتہ ہتھیار متھیار کی حالت ابھی کمزور ہے' اس کے لئے زرمبادلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور زرمبادلہ اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک ملکی پیداوار و پیداوار نہیں بڑھے گا۔ لہذا ہم سب کو چھاؤنی میں سبزیاں اگانی چاہئیں' سبزی وبزی صحت کے لئے بھی اچھا ہے اور قوم ووم کے لئے بھی۔''

اس تقریر کی رپورٹنگ کرنے میں مجھے خاصی دقت پیش آئی۔

یہ سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر ۲۹ فروری ۱۹۷۶ کو جنرل ٹکا خان ریٹائر ہو گئے۔

میں زمانہ طالب علمی میں انسانی نفسیات کا مطالعہ کرتا رہا ہوں لیکن دو سالہ قید کے دوران انسانی سرشت کی جتنی پرتیں کھلیں' سینکڑوں کتابیں پڑھ کر بھی کبھی نہ کھلیں' کسی نے سچ کہا تھا' انسان سب سے بڑی کتاب ہے۔اس کا مطالعہ سب سے بڑا علم ہے۔ میں نے جتنی انسانی کتابوں کے ورق الٹے مجھے محسوس ہوا کہ ان میں سے ہر کوئی اپنی ذات کا اسیر ہے' اس کے اپنے مسائل ہیں۔گھر بار' بیوی بچے' جائیداد' رشتے' شادیاں' روپیہ پیسہ' قرض' قرضے کی ادائیگی' ماں کی بیماری' والد کی ریٹائرمنٹ' بہن کا بیاہ' بھائی کی ملازمت! یہ سب اپنی جگہ گھمبیر مسائل تھے جو غیر معینہ قید کی وجہ سے غیر معینہ عرصے تک معرض التواء میں نہیں ڈالے جاسکتے تھے۔ لوگ اپنے اپنے مسائل اپنے اپنے سینوں میں دفنائے گم سم زندگی گزار رہے تھے۔میں نے کئی بار دیکھا وہی اصحاب جو چار یاری میں خوب چہکتے تھے اکثر تنہا لمحوں میں اپنی بیرک کے آگے پتلی سی پگڈنڈی پر ٹہلنے لگتے تھے۔اپنے خوابوں اور خیالوں میں گم۔۔۔۔ ماضی کے خیال اور مستقبل کے خواب!! اگر میں اچانک ان کے پیچھے جا پہنچتا تو وہ یوں چونک اٹھتے جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار کر دیئے گئے ہوں۔

قید بڑی ظالم شے ہے یہ انسان کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ہر لحاظ سے ننگا! جسمانی لحاظ سے بھی اور اخلاقی لحاظ سے بھی' یعنی ایک تو ایک دوسرے کے سامنے کپڑے بدلنے سے کسی کا کسی سے ستر نہیں رہتا اور دوسرے کہ متواتر ساتھ رہنے سے ہر کسی کا اندرونی عکس بھی سامنے آجاتا ہے۔آپ پیاز کے چھلکے اور نلکے کے پانی پر جھگڑا کرنے سے لے کر ملکی مسائل کے بارے میں ردعمل سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔میرے ذاتی تجربے کے مطابق ہر عہد ابتلا انسان کے اندر چھپی ہوئی ہر بلندی اور ہر پستی کو آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھاڑ کر سامنے پھینک دیتا ہے۔میں بے حجابی کے اس دور میں عظیم انسان بھی دیکھے اور حقیر بھی۔۔۔عظیم زیادہ حقیر کم' بجھے بجھے کئی' مہجور و مایوس خال خال!!

ہمارے آقاؤں نے ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی' انہوں نے نہ صرف کیمپ کے اندر بھائی کو بھائی سے لڑانے اور صوبائی تعصب کو ہوا دینے کی پوری کوشش کی بلکہ چیدہ چیدہ دانشور کیمپوں میں بھیج کر ہمیں Brain-Wash کرنے کے بعد کئی جتن کئے۔''ہمہ یاراں دوزخ'' میں اس ذہنی جنگ وجدل کی ساری تفصیلات درج ہیں' یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ بھارتی آقاؤں کے سارے جتن اکارت گئے اور تقریباً سبھی قیدی تند و تیز لہروں میں اٹل چٹانوں کے طرح ڈٹے رہے۔۔۔کچھ سطح آب کے نیچے اور کچھ سطح آب کے اوپر!

اس گھمبیرتا میں بھی ردائے زندگی کے چمکیلے تارا بھرتے رہے' بارش غم کے باوجود خوش دلی کی دھوپ چمکتی رہی اور آنسوؤں کی مالا

کے زیر سایہ بھی مغموم ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرتی رہی۔ کچھ لوگ ویسے ہی اتنے سخت جان تھے کہ وہ کسی بھی بھٹی میں گھلنے کو تیار نہ تھے اور کچھ خط و کتابت کے ذریعے سامان تفنن مہیا کر دیتے تھے۔ ہمارا ایک ساتھی علامہ اقبال کو اس لئے رومانی شاعر کہنے پر اصرار کرتا تھا کہ ان کی ایک نظم ''حسن وعشق'' میں نگہت' گلزار اور شمیم جیسی حسیناؤں کے نام آتے ہیں' دوسرے صاحب کسی مسئلے پر اظہار خیال سے معذرت کرتے ہوئے اردو محاورے کی ٹانگ یوں توڑتے تھے کہ ''آپ کے سامنے میرا منہ کھولنا بھینس کے آگے بین بجانا ہے۔''

پھر ہمارے ساتھ قید پاکستانی خاکروب مانو کا وہ خط تو سارے کیمپ میں مشہور ہو گیا جس میں اس کی ماں نے لکھا تھا کہ بیٹا ہمیں تمہاری نئی نوکری بالکل پسند نہیں کیوں کہ اس نوکری میں تمہاری تنخواہ تو باقاعدگی سے گھر پہنچ جاتی ہے لیکن دو سال سے تمہارا دیدار نہیں ہوا' ہمیں ایسی نوکری کا لالچ نہیں' تم فوراً یہ ملازمت ٹھکرا کر گھر آ جاؤ' اپنا کام یہاں قریبی کوٹھیوں میں بھی مل جاتا ہے''

پھر ایک دن میجر اے۔جی شاہ نے مجھے اپنی بیوی کا خط دکھایا' جس میں محترمہ نے اپنے شوہر کی یوں تعریف لکھی تھی کہ

''مائی ڈیر

مجھے پختہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن تم رہا ہو کر ضرور میرے پاس آؤ گے لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا تو بھی غم کرنے کی ضرورت نہیں' آپ نے اپنی پنشن اور بیمے کے کاغذات ایسے سلیقے سے اپنی پرسنل فائل میں لگا رکھے ہیں کہ مجھے تمہاری پنشن گرایجوایٹی اور دیگر واجبات وصول کرنے میں ذرا دقت پیش نہیں آئے گی۔

آپ کی رفیقہ حیات......مسز شاہ''

ہماری رہائی کا وقت قریب آیا تو بھارتی آقاؤں کا رویہ بھی بدلنے لگا۔ اب وہ ہم سے انسانی سطح پر بات کرنے لگے' کسی کے ساتھ سرگودھا' سیالکوٹ' نوشہرہ یا پشاور کا رشتہ جتاتے' کسی کے ساتھ آرمرڈ کور' آرٹلری یا سگنلز کی پینگیں بڑھاتے اور کسی کے ساتھ پرانی مشترکہ درس گاہوں (مثلاً گورنمنٹ کالج لاہور' مرے کالج سیالکوٹ' اسلامیہ کالج پشاور) کا حوالہ دیتے اور امید رکھتے کہ ہم اپنے سامان کے ساتھ ان کے لئے خیر سگالی کی پوٹلیاں بھی باندھ کر پاکستان لے جائیں گے۔

یہ حالات دیکھ کر ایک دوست نے کہا۔ ''پارٹنر! ہم نے تو سنا تھا کہ ہندو بڑا دور اندیش ہوتا ہے' ہمیں تو وہ بڑا احمق لگا۔ اس کی خوش قسمتی اور ہماری بدقسمتی کہ یک مشت نوے ہزار پاکستانی اس کے ہاتھ لگ گئے اور دو سال تک اس کے رحم و کرم پر رہے' اگر وہ تھوڑی سی فراخدلی اور دور اندیشی دکھاتا تو اچھے انسانی سلوک کے ذریعے ان نوے ہزار قیدیوں کو نوے ہزار سفیروں میں بدل سکتا تھا' ایسی صورت میں وہ سب پاکستان جا کر ہندوؤں کے متعلق پھیلا ہوا تعصب دھو ڈالتے' لیکن ان کوتاہ اندیشوں نے ہماری عزت نفس پر

پے در پے چرکے لگا کر ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہایت متعصب اور تنگ نظر ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد نے ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے الگ وطن بنانے کا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ جو صائب بھی ہے اور اٹل بھی!

ہم دو سال کی طویل و تاریک رات کاٹ کر بالآخر ۱۹۷۳ کے اختتام پر دوبارہ وطن عزیز کی دھوپ اور چاندنی میں واپس آ گئے۔ شکر الحمد للہ!

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

چار سال کی جدائی کے بعد مغربی پاکستان واپس آیا تو دنیا بدل چکی تھی' بچا کچا مغربی پاکستان' نیا اور مضبوط تر' پاکستان بن چکا تھا' مارشل لاء ہمیشہ کے لئے دفنانے کے بعد' نئی جمہوری حکومت برسر اقتدار آ چکی تھی' ہر جگہ عوامی حکومت کا چرچا تھا' فوج سہمی ہوئی تھی' اس کا مورال خاصا نیچے تھا' احساس شکست سے افسر اور جوان چور چور تھے' رہی سہی کسر جمہوری حکومت پوری کر رہی تھی تا کہ 'سانپ' دوبارہ نہ اٹھ سکے۔

میں ۱۹۷۴ء کے اوائل میں دوبارہ آئی ایس پی آر میں حاضر ہوا' تو اس ادارے کی قیادت آرمرڈ کور کے ایک سینئر آفیسر بریگیڈئر فضل الرحمٰن کے سپرد تھی' وہ پی آر کے معاملے میں اتنے ہی نابلد تھے' جتنے پی آر والے آرمرڈ کور کے بارے میں ہوتے ہیں' ایسی حالت میں کئی دقتیں بھی ہوتی ہیں اور کئی سہولتیں بھی' سہولت یہ کہ آپ کی پیشہ ورانہ کارکردگی پر کوئی گرفت نہیں ہوتی اور دقت یہ کہ آپ سے ایسے کام کروائے جاتے ہیں۔ جو پیشہ ورانہ دیانت یا روایت کے منافی ہوتے ہیں' مثلاً لاہور کے ایک اخبار نے ان دنوں شہ سرخی میں ایک ذیلی سرخی یہ لگا دی کہ حالیہ ہنگاموں میں مرنے والوں میں ایک شخص فوج کی گولی سے بھی مرا ہے' مجھے حکم دیا گیا کہ فوراً لاہور جاؤ' ایڈیٹر سے ملو اور اسے کہو کہ وہ صفحہ اول پر عین اسی جگہ 'معافی نامہ' چھاپے' جہاں گولی والی خبر چھپی تھی۔ میں حکم کا مارا چلا تو گیا لیکن جانتا تھا کہ یہ نادر شاہی حکم شرمندہ تعمیل نہ ہوگا۔۔۔۔ادھر سیاسی فضا ایسی تھی کہ فوج کے دامن سے داغ دھونے کی بجائے اسے مزید داغدار کرنے کی پوری کوششیں کی جا رہی تھی' لہٰذا مذکورہ اخبار نے سیاسی حکومت کا سہارا لیا اور فوجی حکم کو نظر انداز کر دیا۔ جس فوج کو حکومت وقت نظر انداز کر دے' اسے اور کوئی کیوں نظر میں رکھے گا۔

اگرچہ مجھے ایبٹ آباد کی ابتدائی ٹریننگ کے دوران منہ بند رکھنے کی تلقین کی جا چکی تھی لیکن سقوط ڈھاکہ اور قید بھارت نے جہاں اور بہت سے زخموں کے منہ کھول دیئے تھے وہاں میرا منہ بھی کھول دیا تھا۔ میں بہت سے دوسرے جنگی قیدیوں کی طرح بڑی شدومد سے محسوس کرتا تھا کہ حق بات کہنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ خواہ حق بات کہنا کتنا ہی خطرناک کیوں نہ ہو۔

میں نے بھارت سے واپسی پر بچے کھچے پاکستان کو 'نیا اور مضبوط پاکستان' کہتے سنا تو میرا دل کھول اٹھا' سقوط مشرقی پاکستان' کے المناک باب کو قومی تاریخ سے پھاڑ پھینکنے کی حمایت میں یہ دلیل بھی سننے میں آئی کہ مشرقی پاکستان تو ایک اقتصادی بوجھ تھا' اچھا ہوا اتر

گیا۔ یہ سن کر میرے ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور میں نے بھری محفل میں کہنا شروع کیا کہ اگر اقتصادی بوجھ اتارنے کا مسئلہ ہے تو بلوچستان کا بوجھ بھی اتار پھینکو۔۔۔اور شاید اسی مقصد کے لئے مشرقی پاکستان کی طرح اب وہاں بھی فوج ایکشن کیا جا رہا ہے۔ میری جلی کٹی باتیں سن کر ایک ہمدرد رفیق کار نے کہا۔

''ہش ہش' زبان روکو''

''کیوں''

''پکڑے جاؤ گے''

''کیوں' عوامی راج ہے' جمہوری حکومت ہے' جمہوریت کی شرط اول آزادی اظہار ہے' قائد عوام خود کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کے بے زبان عوام کو زبان دی ہے۔۔

''وہ ٹھیک ہے' لیکن تم شاید یہ نہیں جانتے کہ قائد عوام جو بے زبانوں کو زبان دیتے ہیں' زبان والوں کی زبان کھینچ بھی لیتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے کمیونسٹ روس کا ایک واقعہ سنایا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک اجتماع میں پارٹی کے ایک لیڈر کہہ رہے تھے کہ ہم نے اتنی اقتصادی ترقی کی ہے' عوام کو یہ یہ سہولتیں بہم پہنچائی ہیں' اتنے ہسپتال اور سکول بنائے ہیں اور فلاں فلاں علاقے میں اتنے رہائشی فلیٹ تعمیر کرائے ہیں۔ متعلقہ علاقے کا نمائندہ بول اٹھا کہ وہاں کوئی فلیٹ تعمیر نہیں ہوئے۔ لیڈر نے کہا۔ میں اگلے ماہ ہونے والے اجتماع میں اس کا جواب دوں گا' اگلے ماہ اجتماع ہوا تو سوال پوچھنے والا غائب تھا۔

واقعہ سنانے والے نے احتیاطاً مذکورہ واقعہ روس کے سر تھونپ دیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد میری ملاقات لیفٹیننٹ جنرل ضیاء الحق سے ہوگئی جو راولپنڈی میں کور کمانڈر کانفرنس کے لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ میری تازہ کتاب' ہمہ یاراں دوزخ' دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے اسی کتاب کے حوالے سے مجھے بلوایا' کتاب کے متعلق چند کلمات کہے اور مربیانہ لہجے میں فرمایا'' میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں''

عرض کیا۔ مجھے فوج سے نکلوا دیجیے''

پوچھا'' کیوں''

میں بھرا پڑا تھا' پھٹ پڑا' میں نے عرض کیا۔

''۱۹۷۱ء کے المیے سے قوم نے کچھ سیکھا ہے نہ فوج نے' لوگ ایسے زندگی گزار رہے جیسے پکنک پر آئے ہوں' کسی کو ذرا بھی احساس زیاں نہیں' حکومت تو سیاسی مصلحتوں کے تحت سقوط ڈھاکہ کا باب اپنی قومی تاریخ سے پھاڑ پھینکنا چاہتی ہے لیکن زیادہ افسوس اس بات کا ہے' کہ فوج میں بھی اصلاح احوال کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میں یونٹوں میں گیا ہوں' فوجی آفیسر ٹریننگ گراؤنڈ کی بجائے دفتروں میں ڈیزرٹ کولر لگائے بیٹھے ہیں۔ فارمیشن ہیڈ کوارٹر میں لوگ کاروں اور پلاٹوں کی الاٹمنٹ کی باتیں کرتے ہیں' کھاریاں سے ایک فارمیشن جہلم کے پاس ٹلہ رینجر پر سالانہ فائرنگ کے لئے روانہ ہوا' تو آدھی گاڑیاں راستے میں بریک ڈاؤن ہو گئیں' جو توپیں وہاں پہنچیں' ان کے نشانے خطا گئے' کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لئے نشانہ بازی کے بوگس نتائج مرتب کئے گئے۔ آخر ہم کس کو دھوکا دے رہے ہیں۔ فوج جسے ۱۹۷۱ کے شدید جھٹکے کے بعد سنبھل جانا چاہئے تھا' بالکل نیچے جا رہی ہے' میں ہی نہیں فوج کے کئی آفیسر بددل ہو کر سروس چھوڑنا چاہتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ افسروں' خاص کر میجروں کی کمی کے باعث رہائی ممکن نہیں' جن کی سفارش ہے وہ تو گھر بھی جا رہے ہیں اور سول سروس میں بھی اور جو مجھ جیسے ہیں' وہ ٹنگے ہوئے ہیں۔''

جنرل ضیاء الحق نے بڑے صبر و تحمل سے میری بات سنی' انہوں نے ایک لمحے بھر کو بھی مجھے روکنے یا ٹوکنے کی کوشش نہ کی' میں کہتا رہا' وہ سنتے رہے' میں غبار خاطر پھینکتا رہا' وہ برداشت کرتے رہے' جب دل کی بھڑاس نکال چکا تو انہوں نے فرمایا۔ ''آپ کا تجزیہ خاصی حد تک درست ہے' میں آپ کا راستہ روکنا نہیں چاہتا لیکن میری درخواست ہے کہ آپ سال ڈیڑھ سال کے لئے رک جائیں' شاید اصلاح احوال کی کوئی صورت نکل آئے۔''

اس وقت تک فوج کی سربراہی کے لئے ان کا نام دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا' پتہ نہیں ان کے لاشعور میں کوئی بات تھی یا انہوں نے ویسے ہی مجھے ٹھنڈا کرنے کے لئے یہ بات کہہ دی تھی' لیکن ڈیڑھ سال بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ چیف آف آرمی سٹاف مقرر ہو گئے۔

ہندوستان سے واپسی کے بعد اور جنرل ضیاء الحق کی تقرری سے پہلے میں نے آئی ایس پی آر میں جو نوکری کی' اس کا اہم پہلو بلوچستان میں آرمی ایکشن ہے' جس کی کوریج کے لئے مجھے کئی مرتبہ مری بگٹی ایریا میں بھیجا گیا' جہاں پیشہ ور فوجی سرکش قبائلیوں کا تعاقب کر رہے تھے' یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جسے فوجی طاقت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ گویا ہم نے مارچ ۱۹۷۱ کے فوجی ایکشن سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا کیونکہ وہاں بھی ہم نے ایک سیاسی مسئلے کو فوجی انداز میں حل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے عبرت ناک نتائج بھگتے تھے۔

مجھے کوئٹہ میں ڈویژن ہیڈکوارٹر کے ساتھ منسلک (Atach) کیا گیا لیکن میرا کام کوئٹہ سے باہر تھا' جہاں خشک پہاڑیوں اور بنجر کھیتوں کے سوا کچھ نہ تھا' کہیں کہیں بکھری ہوئی آبادی تھی جیسے صحرا میں دور دور جھاڑیاں اگی ہوتی ہیں۔ اکثر قبائلی مرد فوج کے خلاف برسرپیکار تھے البتہ ان کے اہل وعیال اپنی اپنی کلی میں موجود تھے' البتہ بعض انتہا پسند قبائلی اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے گئے تھے یا انہیں سرحد کے پار افغانستان میں بھیج چکے تھے۔

میں نے اس ایکشن پر مامور فوجیوں سے ملاقات کی تو انہیں خاصا پریشان پایا' دراصل فوج ایسے کام محض تعمیل حکم کے طور پر کرتی ہے۔ ورنہ وہ نہیں چاہتی کہ کرفیو نافذ کرنے' سرکش قبائلیوں کی سرکوبی کرنے یا ڈاکوؤں کا تعاقب کرنے کے لئے اسے تعینات کیا جائے اور وہ تعمیل حکم میں اپنے ہی ہم وطنوں پر گولیاں چلائے' انہی دنوں سننے میں آیا کہ کراچی میں کرفیو لگا تھا اور کرفیو نافذ کرنے کے لئے وہاں فوج متعین تھی' کسی شہری نے کرفیو کے احکامات کی خلاف ورزی کی تو ڈیوٹی پر موجود فوجی جوان نے اسے روکا' اس نے رکنے سے انکار کر دیا' فوجی جوان نے سختی سے کہا۔ ''اگر اس سے آگے بڑھے تو گولی مار دوں گا''۔ سویلین شخص نے جواب دیا۔ جا' جا' آیا بڑا گولی مارنے والا' جہاں گولی مارنے کا وقت تھا' وہاں تو سرینڈر کر آیا اب ہم نہتوں پر گولی چلانے کی دھمکی دیتا ہے''۔ بے چارے فوجی کے پلے کیا رہا۔

اگرچہ مری قبائلی نہتے نہ تھے لیکن پھر بھی اپنے ہم وطن تھے' اور اپنے ہم وطنوں پر گولیاں چلاتے وقت ہر فوجی کے دل میں ایک ٹیس ضرور اٹھتی ہے' وہ چاہے تو اسے حکم کی سنگینی دکھا کر دبا دے اور چاہے تو اس پر عمل کر کے ہاتھ روک لے' لیکن اس کے دل میں خیال ضرور آتا ہے۔ میرے خیال میں وہ دن گئے جب لوگ صرف حکم ملنے پر بلا جھجک خانہ کعبہ پر گولیاں چلا دیتے تھے' ڈسپلن اب بھی موجود ہے لیکن آج کا سپاہی ایک مشین نہیں باشعور انسان ہے اور اسے خاصے شعور کے ساتھ ہی استعمال کرنا چاہیے۔

میں تیسری دفعہ کوہلو گیا تو مقامی بریگیڈ کمانڈر بڑا خوش نظر آیا' میں نے اس کی خوشی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اس نے مقامی قبائلیوں کے خلاف جنگ جیت لی ہے' اب وہ پہاڑوں سے اتر آئے ہیں' واپس اپنے اپنے علاقوں میں آباد ہو رہے ہیں' حکومت ان کی آبادکاری کی پوری کوشش کر رہی ہے' ٹیوب ویل لگ رہے ہیں' باغ کاشت کئے جا رہے ہیں' سڑکیں بن رہی ہیں' ایک مہذب زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔

بریگیڈیئر صاحب نے مزید فرمایا کہ انہوں نے اپنے تجربات پر مبنی ایک کتاب بھی لکھی ہے' جس پر وہ میری رائے چاہتے ہیں' میں نے قیام کوئٹہ کے دوران اس کتاب کا مطالعہ کیا' اس کے دیباچے میں لکھا تھا کہ دو سال پہلے جب میں وادی کاہان آیا تھا تو خاصی

مخاصمانہ فضا تھی' فوج اور مقامی آبادی کے درمیان خاصی کشیدگی پائی جاتی تھی' لیکن میں نے فوجی ایکشن کے علاوہ ذاتی طور پر ایسی مصالحانہ کوششیں کیں کہ جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو قبائلی سرداروں کا ایک جتھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا ''بریگیڈیر صاحب آپ نے ہم پر بہت سی عنایات کی ہیں' جاتے جاتے ایک اور عنایت کرتے جایئے' یہاں ایک وسیع و عریض یتیم خانہ بنوا دیجیے''

میں نے بریگیڈیر صاحب کو مشورہ دیا کہ آخری عنایت کا ذکر کاٹ دیں کیونکہ اس میں اعتراف جرم کی بو آتی ہے۔

۱۹۷۵'۱۹۷۶ میں مجھے پنجاب' سرحد اور سندھ کی کئی چھاؤنیوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا' وہاں میں نے محسوس کیا کہ فوج اب وہ فوج نہیں رہی جو میں نے ۱۹۶۴ میں دیکھی تھی' پچھلے دس گیارہ برسوں میں اس میں قومیت کا احساس شدت سے ابھرا ہے۔ اب لوگ (چند استثنیٰ کو چھوڑ کر) انگریزوں کی نقل کرنا باعث فخر نہیں سمجھتے۔ انگریزی سوٹ ضرور پہنتے ہیں' لیکن انگریزوں کی طرح بولنا' کھانا اور رہنا سہنا پسند نہیں کرتے' خانسامے' کک' ویٹر' حتیٰ کہ مالی تک بنگلوں سے غائب ہو چکے ہیں' فوجی افسر انگریزی بھی منہ ٹیڑھا کر کے نہیں بولتے بلکہ اردو بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں' ریڈرز ڈائجسٹ' ٹائم' نیوز ویک اور لائف میگزین کے شوقین اب دیسی رسالے بھی پڑھ لیتے ہیں' مجھے اکثر چھاؤنیوں میں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ان میں سے کئی افسروں نے میری اردو کی کتاب پڑھی ہوئی تھی۔

مجموعی طور پر مجھے یوں لگا کہ فوج کی وارنش اتر چکی تھی۔ اب وہ اپنے اصلی خدوخال اور رنگ ڈھنگ میں ابھر رہی تھی۔ یہ ارتقائی سفر کا ایک اہم اور خوشگوار مرحلہ تھا کیونکہ جب تک کوئی ادارہ اپنے عہد غلامی کی ذہنی ٹوپی نہیں اتارتا' عہد آزادی کا کلاہ نہیں پہن سکتا۔ بے شک آج فوج کی وردی اور اس کا ظاہری رنگ ڈھنگ (حتیٰ کہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ) ہنوز برطانوی طرز کا ہے لیکن اس کی سوچ خاصی حد تک قومی رنگ میں ڈھل چکی ہے' اس کے ہیرو اپنے ہیں' اس کی اقدار اپنی ہیں' ان کی امنگیں اپنی اور اس کے خواب اپنے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں فوج میں یہ تبدیلی ایک خوشگوار پیش رفت ہے۔

◆◆◆

۱۹۷۷ء کا تاریخی سال

۱۹۷۷ء کا سال تبدیلیوں کا سال تھا' پہلی تبدیلی تو میری زندگی میں آئی کہ میں میجری کی عدت پوری کرنے کے بعد لیفٹیننٹ کرنل بن گیا۔ دوسری تبدیلی ہمارے ادارے میں آئی کہ بریگیڈیئر فضل الرحمٰن کی ریٹائرمنٹ پر ایک کہنہ مشق ساتھی تفضل حسین صدیقی اس کے ڈائریکٹر بن گئے اور تیسری اہم پیش رفت جو یادگار تبدیلی کا پیش خیمہ بنی' یہ تھی کہ حکومت وقت نے آئندہ انتخابات کا اعلان فرما دیا۔ یہ تینوں واقعے ماہ جنوری میں رونما ہوئے۔

فوجی سرجنوں اور آئی ایس پی آر کے افسروں میں ایک قدر مشترک یہ پائی جاتی ہے کہ رینک کی تبدیلی سے ان کے کام میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' سرجن کپتانی یا میجری کے وقت نشتر ہاتھ میں لیتے ہیں اور انسانی جسموں کو چیرتے پھاڑتے لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچ جاتے ہیں۔ پی آر والے بنیادی طور پر رپورٹنگ سے آغاز کرتے ہیں اور ہاتھ میں قلم تھامے یہی کام کرتے کرتے کرنل اور بریگیڈئر بن جاتے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے تو قلم اور پی آر کے مشترک جوہر ایسے دکھائے کہ دو سال کے قلیل عرصے میں میجر سے ترقی پاتے پاتے بریگیڈئر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ خطرہ تھا کہ اگر ان کے راستے میں رکاوٹ نہ آئی تو یہ مزید دو سالوں میں کمانڈر انچیف بن جائیں گے لیکن اللہ نے بچا لیا۔

میری ترقی معمول کے مطابق تھی یعنی جس رفتار سے فوج میں ترقیاں ہو رہی تھیں اسی حساب سے میرے اوپر فضل و کرم کی بارش بھی ہوتی رہی اور جب لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد آٹھ نو سالہ خشک سالی کا دور آیا تو میں بھی اس سے متاثر ہوا۔ اور ۱۹۸۵ء میں جا کر بریگیڈئر بنا۔ بات رینک کی نہیں' قسمت کی ہے کیونکہ فوج ہو یا سول ترقی پانے کی اہلیت ہی کافی نہیں ہوتی' دیگر عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ جن میں قسمت سرفہرست ہے۔

ترقی بھی عجیب چاٹ ہوتی ہے۔ اس کے لالچ میں انسان آگے ہی لڑھکتا رہتا ہے۔ لڑھکتے لڑھکتے کبھی عزت و آبرو کی معراج پر پہنچ جاتا ہے اور کبھی قعر ذلت میں گر جاتا ہے لیکن جب تک پروموشن کی آس لگی رہتی ہے فوج کے دامن سے چمٹا رہتا ہے۔

میں کرنیلی کو زینت شانہ بنائے نوٹ بک ہاتھ میں اٹھائے فوجی تقریبات کی کوریج کے لیے جاتا رہا۔ وقتاً فوقتاً مجھے جنرل ضیاء الحق کی عسکری مصروفیات کی رپورٹنگ کے لیے بھی بھیجا گیا۔ کیونکہ ڈی پی آر کا خیال تھا کہ میری کتاب (ہمہ یاراں دوزخ) کے حوالے

سے وہ اپنے دل میں میرے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور چیف متعلقہ پی آر او کے لیے نرم گوشہ رکھتا ہو تو ڈی پی آر ہر قسم کی گرمی سردی سے محفوظ رہتا ہے چنانچہ میں اکثر و بیشتر چیف کی مصروفیات پر مبنی اخباری مراسلے کبھی ملتان اور کراچی سے اور کبھی پشاور اور آزاد کشمیر سے بھیجتا رہا۔ وہ قومی اخبارات میں چھپ تو جاتے تھے لیکن کہیں اندر کے صفحات پر۔۔۔ وہ بھی سنگل یا زیادہ سے زیادہ ڈبل کالم۔۔۔ اخبار والے بھی کتنے نادان ہوتے ہیں چند ماہ بعد اٹھنے والے طوفان کا بھی اندازہ نہیں کر سکتے۔

ان دوروں میں' میں نے جنرل ضیاء الحق کو ذرا قریب سے دیکھا تو ان کی ایک خوبی جو مجھے واضح طور پر نظر آئی یہ تھی کہ وہ پبلک ریلیشنز کے میدان میں ہم پیشہ ور پبلک ریلیشنز والوں سے کوسوں آگے ہیں۔ کیا مجال کہ جرنیل سے سپاہی تک لیفٹیننٹ کرنل سالک سے اس کے فوٹوگرافر تک سب کی انا' ضرورتوں اور خواہشوں کا خیال نہ رکھیں' خواہ کتنے ہی جلدی میں کیوں نہ ہوں' ہیلی پیڈ پر اترنے کے بعد سرکاری پروٹوکول کے مطابق صف بستہ تین چار اعلیٰ افسروں سے مصافحہ کرنے کے بعد ان افراد کے پاس بھی جاتے جو اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں وہاں موجود ہوتے تھے۔ ان میں ملٹری پولیس کے جوان' سیکورٹی کا عملہ' آرمی میڈیکل کور کی ایمبولینس کا سٹاف حتیٰ کہ فائر بریگیڈ کے آدمی شامل ہوتے تھے وہ بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے اور ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ ورنہ آرمی چیف کو کیا پڑی کہ فائر بریگیڈ کا ملازم سٹیشن ہیڈ کوارٹر میں کام کرتا ہے یا کنٹونمنٹ بورڈ میں؟

ہم ایک مرتبہ آزاد کشمیر کے دورے پر تھے اس کی ایک شمالی چھاؤنی کیل (Kel) سے بذریعہ ہیلی کاپٹر واپس راولپنڈی آرہے تھے کہ مشین میں خرابی کی وجہ سے ہمیں مظفر آباد اترنا پڑا' مقامی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو خیر مقدمی انتظامات کے لیے بہت کم موقع ملا پھر بھی وہ بھاگم بھاگ ہیلی پیڈ پر پہنچے ہمیں خوش آمدید کہا۔ میس میں لے گئے اور جب تک ہم وضو کر کے نماز ادا کرتے کچھ آملیٹ اور کچھ سبزی کی بھجیا بنا کر اور ٹوسٹ سینک کر لے آئے۔ ہم کھانے کی میز پر پہنچے تو بھوک خاصی چمک چکی تھی۔ میں تو کھانا دیکھتے ہی پل پڑا۔ لیکن جنرل ضیاء الحق نے ہاتھ روکے رکھا۔ وہ تفتیش کر رہے تھے کہ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کہاں گئے اور آیا انہیں کھانا ملا ہے یا نہیں؟ اتنے میں پائلٹوں کو تلاش کر کے لایا گیا تو جنرل ضیاء الحق نے پہلا لقمہ لیا۔ اپنی بھوک روک کر دوسرے کی بھوک کا خیال رکھنا یقیناً عالی ظرفی ہے۔

انہی سرکاری مصروفیات میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا عام انتخابات سر پر آگئے۔ ان انتخابات کے دوران امن عامہ برقرار رکھنے کے لیے فوج کو کوئی ذمہ داری سونپی گئی یا نہیں مجھے تو انتخابات اور فوج کا باہمی تعلق اس وقت معلوم ہوا جب پی این اے نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں دھاندلی کا مسئلہ اٹھایا اور دو دن بعد منعقد ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ اس

کے بعد دوبارہ انتخابات کرانے کے لیے تحریک چلی اور حکومت اور اپوزیشن میں ٹھن گئی۔ مجھے پہلی مرتبہ جی ایچ کیو کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

جی ایچ کیو میں سرسراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ حکومت وقت نے سویلین ایجنسیوں کو غیر موثر پاتے ہوئے فوج کا سہارا لیا تھا۔ فوجی دستے کمر بستہ ہو کر کراچی' لاہور' حیدر آباد' ملتان اور دوسرے متاثرہ شہروں میں پہنچ چکے تھے۔ آرمی چیف Command Communications کے ذریعے اور چھاؤنیوں میں ذاتی دوروں کے دوران اس بات پر زور دیتے رہے کہ فوج حکومت کی دست راست ہے یہ اس کا ایک ذیلی دارہ ہے۔ اور اس آڑے وقت میں حکومت کی مدد کرنا اس کا فرض ہے۔ چنانچہ فوج مارچ سے جون تک عوام کے غیظ وغضب کا سامنا کرتی رہی گولیاں چلاتی اور گالیاں کھاتی رہی حتی کہ جولائی ۱۹۷۷ء کا مہینہ آ گیا۔

میں نے یکم جولائی سے ایک ماہ کے لیے بیرون ملک چھٹی (Leave Ex Pakistan) لے رکھی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اپنا رخت سفر اپنی پیٹھ پر لادوں گا اور امریکی سیاحوں کی طرح کئی ملکوں کی خاک چھانتا ہوا براستہ افغانستان اور ترکی یورپ پہنچوں گا۔ اور واپسی پر زاہدان کے راستے کوئٹہ پہنچوں گا۔ اور سفر کے دوران تجربات کی جو پونجی اکٹھی کروں گا۔ میرا پلان اپریشن فیئر پلے سے کچھ کم نہ تھا۔

البتہ ویزا دینے میں افغان سفارت خانے نے دیر کر دی پھر بھی میں نے احتیاطاً راولپنڈی سے کابل تک جی ٹی ایس پر اپنی سیٹ بک کرائی' دو تھیلے۔۔ ایک بھاری اور ایک ہلکا۔۔ کپڑوں' جوتوں' کتابوں کیمرے اور فلموں سے بھر لیئے۔ ۴ جولائی کو افغان سفارت خانے دوبارہ گیا انہوں نے کہا اگرچہ وعدہ آج کا تھا لیکن ایک مجبوری کی وجہ سے ایک دن تاخیر ہو گئی ہے آپ کل صبح دس بجے ویزا لے جائیں۔۔ اس ایک دن کی تاخیر نے میری زندگی کی راہ بدل دی۔

میں حسب معمول ۴ جولائی کی رات کو ۱۱ بجے کے قریب سویا۔ سفر کے متعلق جتنے خواب دن کے وقت دیکھتا تھا ایک ایک کر کے رات کو ستانے لگے۔

میں کبھی طورخم پہنچا ہوا ہوں تو افغان حکام میرے کاغذات میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ کبھی کابل اور ترکی کی سرحد پار کر رہا ہوں تو افغان سپاہی میرے سامان کی تلاشی لے رہے ہیں کہیں راستے میں پوٹلی سرہانے رکھ کر سویا ہوا ہوں تو جاگتے وقت غائب ہے' کہیں یورپ کی کسی شاہراہ پر ایک حسینہ سے ملاقات ہوئی ہے تو وہ وعدہ فردا کر کے چلی جاتی ہے۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی' میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ رسیور اٹھایا تو جنرل ضیاء الحق کے پرائیویٹ سیکرٹری خاور لطیف بٹ بول

رہے تھے۔ وہ تو نارمل حالات میں بھی ایسی بھبک سے بولتے تھے کہ شریف انسان ہڑ بڑا اٹھتا تھا۔ اب تو وہ رات کو ایک بجے ہنگامی صورتحال میں فون کر رہے تھے۔ میری آواز سنتے ہی بڑھک مارنے کے انداز میں بولے۔ ''اوئے بابا یاد کر رہا ہے تجھے جلدی پہنچو۔''

سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو کیا میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ میری پہلی غیر ملکی چھٹی کو کھٹائی میں ڈالنے کے لیے کسی نے تیسرا مارشل لاء لگا دیا ہے۔ میں نے نیم خوابیدگی کے عالم میں کہا ''میں نہیں سمجھا کس بابے کی بات کر رہے ہو''۔ اس نے پہلے بھی بڑی بڑھک مار کر کہا ''معلوم ہوتا ہے تم ابھی تک سوئے ہوئے ہو۔ وردی پہنو اور جی ایچ کیو میں چیف کو رپورٹ کرو۔

میں نے گھڑی دیکھی ایک بج کر پانچ منٹ ہوئے تھے وردی پہنی اپنی سفید رنگ کی پرانی ڈاٹسن گاڑی نکالی جو چمکتی چاندنی میں بالکل نئی لگ رہی تھی میں ان دنوں ایوب پارک کے پیچھے گلستان کالونی میں رہتا تھا۔ جی ایچ کیو کا راستہ پرائم منسٹر ہاؤس کے پاس سے گزرتا تھا۔ جونہی میں اس اہم مقام کے قریب پہنچا تو فوجی پہرہ داروں نے مجھے روک لیا۔ یہ فوجی پرائم منسٹر ہاؤس کے مستقل پہرہ دار نہیں تھے۔ اس رات کی کاروائی کے لیے باہر سے آئے تھے۔ میں مسئلے کی سنگینی کو نہ سمجھ سکا کیونکہ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ جنرل ضیاء وزیر اعظم بھٹو کے اتنے وفادار ہیں کہ وہ عوامی رائے کے دباؤ کے باوجود یہ انتہائی اقدام نہیں اٹھا سکیں گے۔ یہ ضرور زیڈ اے بھٹو کا مارشل لاء ہوگا جس نے اپنی کرسی کو مضبوط کرنے کے لیے فوج کو استعمال کیا ہے۔

لیکن جس طرح بلوچ رجمنٹ کے ایک لیفٹیننٹ کرنل ریوالور تان کر میری طرف بڑھے' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ معاملہ گمبھیر ہے اس نے مجھے گاڑی سے باہر نکلنے اور اپنی شناخت کرانے کا حکم دیا۔ میں نے پرائم منسٹر ہاؤس کے بغلی دروازے کے پاس داغدار چاندنی میں گاڑی پارک کی اور باہر نکل کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ کرنل صاحب کو شناختی کارڈ دکھایا لیکن ان کی بے مروتی میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس طرح مجھے فون آیا ہے اور میں نے فلاں بابے کے پاس بلا تاخیر رپورٹ کرنا ہے۔ اس نے کہا ''جس بابے کا تم حوالہ دے رہے ہو اسی بابے کا حکم ہے کہ یہاں سے کوئی چرند' پرند' گاڑی گھوڑا وغیرہ نہ گزرنے پائے۔ میں نے اسے بڑی دلیلیں دیں۔ لیکن وہ قائل نہ ہوا۔ وہ خاصا شکنجے میں لگتا تھا۔

تھوڑی دور ایک فوجی جیپ کھڑی تھی جس میں وائرلیس سیٹ لگا ہوا تھا جس کی ٹک ٹک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کرنل صاحب سے کہا ''اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے دوست بریگیڈیر روڈ راج سے بات کر لوں میں نے کہا'' وہ تو ہمارے امام ہیں'' (فوج میں ہنگامی حالات میں کمانڈر کو امام کہتے ہیں) میں نے کہا۔ ''جی ہاں' آپ کے امام ہیں اور آگرہ جیل کے دنوں سے ان کا مقتدی ہوں۔'' وہ خاصا سہم گیا اور اپنے امام سے بات کروا دی۔ یوں مجھے اذن رخصت مل گیا۔

ذرا آگے بڑھا تو پرائم منسٹر ہاؤس کے مین گیٹ کے پاس ایف ایف رجمنٹ کی ایک پارٹی نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے بھی ایف ایف رجمنٹ کی وردی پہنی ہوئی تھی اس لئے ان کا رویہ ذرا ہمدردانہ تھا۔ لیکن سیکورٹی کے معاملے میں وہ بھی کوئی رعایت کرنے کو تیار نہ تھے۔ سر راہے میرے اور ان کے درمیان مذاکرات چل رہے تھے کہ اتنے میں ان کے میجر صاحب ادھر آ نکلے' میجر حشمت جو کیمپ ۴۴ آگرہ میں میرے ساتھ رہے تھے۔ دور سے اپنے سپاہیوں پر گرجے ''اوئے الو' تم نے سر' کو روک رکھا ہے پھر خود آگے بڑھے' سلیوٹ کیا' معافی مانگی اور مزید ایک سلیوٹ کے جلو میں مجھے رخصت کیا۔

میں جی ایچ کیو پہنچا تو رات کے ڈیڑھ بجے بھی دن کا سماں تھا۔ تیز روشنی میں لوگ بیٹھے تھے' ہمارے ڈائریکٹر ایک بغلی کمرے میں منقار زیر پر کیے ہوئے بیٹھے تھے' میں جاتے ہی بابا کے سامنے پیش ہو گیا۔ وہ بڑے پرسکون لگ رہے تھے' بڑے تحمل سے بولے ''کاروائی کا تم نے سن لیا ہو گا۔ صدیقی صاحب سے مل کر ایک پریس نوٹ بنالو جو صبح ریڈیو کے پہلے بلیٹن میں نشر ہونا چاہیے۔ پھر ایک تقریر لکھنی ہے جس کا مسودہ جنرل عارف تیر کر رہا ہے۔

اس تاریخی واقعے کے متعلق یہ میری کل بریفنگ تھی۔ میں اس سے فیضیاب ہو کر ڈی پی آر کے پاس چلا گیا' ہم وہاں بیٹھ کر انگریزی سیدھی کرنے لگے۔ اس حساس کام میں ہمیں فوج کے قانونی ماہرین اور حکومت پاکستان کے مرکزی انفارمیشن سیکریٹری کی راہنمائی بھی حاصل تھی۔ سارا پریس نوٹ چند سطروں پر مشتمل تھا لیکن ایک ایک سطر اور ہر سطر کا ایک ایک لفظ تولا جا رہا تھا مثلاً اس بات پر خاصا وقت صرف ہوا کہ آیا یہ کہا جائے کہ

''افواج پاکستان نے حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے''

یا

''افواج پاکستان نے حکومت سنبھالی لی ہے''

یا

''افواج پاکستان نے ملکی نظم ونسق سنبھال لیا ہے''

بالآخر تیسرے جملے پر اتفاق رائے ہو گیا۔

اس طرح دوسرے پیراگراف میں وزیر اعظم اور دیگر سیاسی رہنماؤں کا ذکر تھا اور کچھ اس قسم کے جملے زیر بحث تھے۔

''حکومت کے اندر اور باہر تمام اہم سیاستدانوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔'' حراست میں لے لیا گیا'' ''یا ان سب کے تحفظ مہیا کر

دیا گیا ہے۔'' بال آخر فیصلہ اس جملہ پر ہوا کہ ان سب کو Protective Custody یعنی احتیاطی تحفظ میں لے لیا گیا ہے۔

دن چڑھے تقریر کا مرحلہ آیا' میں جنرل عارف کے پاس گیا وہ پہلے ہی انگریزی زبان میں مکمل تقریر ٹائپ کروائے بیٹھے تھے، کہنے لگے'' بیٹھ کر اس کا ترجمہ کرو''۔ میں ترجمہ کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے میں بمشکل ایک صفحے کا ترجمہ کر سکا۔ اتنے میں جنرل ضیاء نے ہم دونوں کو طلب فرمالیا اور پوچھا'' تقریر میں کیا دیر ہے' جنرل عارف نے میری طرف دیکھا میں نے سارے صفحے سامنے کر دیئے اور کہا '' ایک صفحے کا ترجمہ کر لیا ہے' چار صفحے باقی ہیں'' کہنے لگے'' چھوڑو ترجمے کو خود تقریر لکھو''

عرض کیا کبھی لکھی نہیں''۔

فرمانے لگے۔

'' جو شخص تین سو صفحے کی'' ہمہ یاراں دوزخ'' لکھ سکتا ہے آدھ گھنٹے کی تقریر بھی لکھ سکتا ہے...... کوشش کرو۔

چنانچہ میں نے کوشش کی' کوئی گیارہ بجے کے قریب جنرل چشتی' جنرل عارف اور چند دوسرے سینئر افسروں کی موجودگی میں جنرل ضیاء کے سامنے رکھی۔ انہوں نے سرخ مارکر کے ساتھ اپنے ہاتھ سے اس میں اصلاح کی (جواب بھی میرے پاس محفوظ ہے) الیکشن سے متعلق تقریر کے حصے میں مختصر سی بحث ہوئی اور یوں اسے حتمی طور پر اپنا لیا گیا۔

پہلے دن کی اطلاعات سے اندازہ ہوا کہ حسب معمول مارشل لاء کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا ہے۔ فوجی کارروائی ملک کے ہر حصے میں کسی خون خرابے کے بغیر مکمل ہوگئی ہے۔ اور چھوٹے بڑے پرندے کوہ مری میں اپنے گھونسلوں میں بحفاظت پہنچ چکے ہیں۔

جنرل عارف نے مجھے کہا کہ آج سے تم سی ایم ایل اے سیکرٹریٹ میں کام کرو گے۔

چنانچہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء سے یکم جولائی ۱۹۸۵ء تک میں کلی طور پر مارشل لاء ڈیوٹی پر رہا اور یوں عسکری زندگی سے میرا براہ راست رابطہ منقطع ہوگیا۔

ان آٹھ برسوں کی روداد ایک الگ کتاب کا موضوع ہے۔

◆◆◆

مارشل لاء کے ملاقاتی

ہم نے مارشل لاء تو بلوالیا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے بٹھائیں کہاں' اکثر اکابرین کا خیال تھا کہ اسے ایوان اقتدار یعنی پی ایم سیکریٹریٹ بھجوانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہاں چلا گیا تو آسانی سے نکلے گا نہیں' دوسرے گروپ کا خیال تھا کہ تین مہینے کی تو بات ہے' یہیں جی ایچ کیو کے پنگھوڑے میں رہنے دو' نپل چوس چوس کر گزارہ کرلے گا لیکن بالآخر طے یہ ہوا کہ اسے پنگھوڑے سے نکال کر ایک عارضی کاٹ (Cot) میں ڈال دو اور یہ Cot جی ایچ کیو اور پی ایم سیکریٹریٹ کے درمیان فردوسی روڈ پر تلاش کر لی گئی جہاں نیشنل سیکورٹی ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا اور اب خالی پڑا تھا۔

جنرل ضیاء الحق اور ان کے چیف آف سٹاف تو وہاں ایک دن بھی نہ بیٹھے البتہ مجھ سمیت باقی عملہ وہاں بھیج دیا گیا اور اسے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز سیکریٹریٹ (سی ایم ایل اے سیکریٹریٹ) کا رعب دار اور خوفناک نام دیا گیا۔ اگرچہ اس کے اندر کچھ نہ تھا (کیونکہ صاحبان اقتدار تو جی ایچ کیو میں بیٹھتے تھے) پھر بھی بہت سے لوگ احتیاطاً' مجبوراً یا عادتاً اس سیکریٹریٹ کا طواف کرنے لگے۔ مجھے پریس سیکرٹری اور سپیچ رائٹر (Speech Writer) کا لاحقہ تو بعد میں نصیب ہوا' اس وقت میرا عہدہ پبلک ریلیشنز آفیسر کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کا کام پبلک کے ساتھ ریلیشنز کا بہتر بنانا ہے۔

پہلے دن میں وہاں بیٹھا تو میرا پہلا بن بلایا مہمان ایک بلا تھا یعنی بلی کا خاوند' یہ آیا تو ساتھ والے بنگلے میں تھا لیکن چائے اور سموسے لانے والے ویٹر کے پیچھے پیچھے امید موہوم باندھے میرے پاس بھی چلا آیا' میں نے مروتاً چائے میں بسکٹ ڈبو کر اسے ڈال دیا جو فوراً چٹ کر گیا' مجھے افسوس ہے کہ میں بعد میں آنے والوں کی اتنی خدمت بھی نہ کرسکا۔

اس دفتر میں میرا کل عملہ ایک چپڑاسی اور ایک پی اے تک محدود تھا۔ پی اے تو کسی بغلی کمرے میں چھپا بیٹھا رہتا تھا' البتہ چپڑاسی سے سارا دن واسطہ پڑتا تھا' وہی گھنٹی سنتا' وہی چائے منگواتا' وہی فائل لے جاتا اور وہی میری باتیں سننے کے بعد باہر جا کر باتیں بناتا۔ میں نے محسوس کیا کہ مارشل لاء ڈیوٹی پر لگنے کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی زیادہ اکڑا ہوا ہے۔ مجھے کرنل محمد خان کا پرانا اردلی یاد آگیا جو ۱۹۶۹ء کے مارشل لاء میں اس لیے اکڑا پھرتا تھا کہ اس کے صاحب کا نام مارشل لاء والوں میں آگیا ہے۔ کرنل صاحب جو ایجوکیشن میں ہونے کی وجہ سے مارشل لاء کی آلائش سے محفوظ چلے آرہے تھے اس انہونی بات پر حیران ہوئے اور انہوں نے اپنے

اردلی سے پوچھا کہ تمہیں کس نے بتایا کہ میں مارشل لاء ڈیوٹی پر لگ گیا ہوں۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا کہ میں نے ریڈیو سے خود آپ کا نام سنا ہے۔ ریڈیو سے چیک کروایا تو پتہ چلا کہ وہاں ایک اعلان ہوا تھا کہ صوبہ سندھ کو مارشل لاء کے کئی ذیلی حصوں (Zones) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں ایک کا نام ٹنڈو محمد خان ہے۔ میرے چپڑاسی کو تو ایسی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے تھی کیونکہ اسے میرا نام اور عہدہ تو معلوم تھا۔

چھوٹے موٹے لوگوں کو تو باہر والا سنتری اور اندر والا چپڑاسی ہی میرے پاس نہ پہنچنے دیتے لیکن جو لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں رعب داب کے ساتھ آتے ان کی پذیرائی ضرور ہو جاتی۔ وہ باہر سنتری سے پوچھتے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر یہی ہے۔ وہ جواباً ایک سیلوٹ مارتا اور اندر جانے کا راستہ دکھا دیتا۔ اندر وہ ایک آفیسر کے پاس جاتا اور پھر دوسرے کے پاس' لیکن ہر کوئی یہ کہہ کر جان چھڑا لیتا کہ یہ میرا شعبہ نہیں ہے' بالآخر وہ شخص میرے پاس پہنچ جاتا۔ پبلک ریلیشنز آفیسر جو ٹھہرا۔

اس طرح پہلا شخص جو میرے پاس آیا' اس نے تھری پیس سوٹ گولڈن پن والی دھاری دار ٹائی کے ساتھ پہن رکھا تھا' کالر اکڑا ہوا تھا اور گردن اس سے بھی زیادہ تنی ہوئی تھی' لگتا تھا مارشل لاء سیکریٹریٹ میں' میں متعین نہیں ہوا' وہ ہوا ہے' نئے جوتوں کی کھٹ کھٹ کے ساتھ میرے دروازے تک آیا اور بڑے فنکارانہ طریقے سے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹا کر کہا۔ ''کیا میں اندر آ سکتا ہوں''۔ ایسے بارعب شخص کو بھلا کون روک سکتا تھا۔ میں نے اسے بلوا کر کرسی پر بٹھایا' اس کا رعب داب دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ ضرور دس بارہ لاکھ کی گاڑی میں آیا ہو گا۔

نئے نئے مارشل لاء کو مقبول بنانے کے لئے میں نے بڑی ملائم اور مہذب گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن مہمان نے اس کا زیادہ موقع نہ دیا' اس نے بولنا شروع کر دیا۔

میں امریکہ میں رہتا ہوں' وہاں اچھی طرح Settled ہوں' ان دنوں اتفاق سے پاکستان آیا ہوا تھا' سوچا پیسہ تو انسان ساری عمر ہی کماتا رہتا ہے۔ کیوں نہ ملک و قوم کی کچھ خدمت کی جائے۔

''جی فرمایئے''

''میں ایٹم بم بنانے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں''

''میری دانست کے مطابق جنرل ضیاء الحق فی الحال تو ایٹم بم بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے' کم از کم مجھ سے انہوں نے ذکر نہیں کیا''

''پوچھ لیجیے اور اگر ان کا ارادہ ہو تو میری طرف سے یہ کارڈ انہیں دے دیجیے میں انٹرکان کے سوٹ نمبر ۱۲۴۴۔۱۱۴ میں ٹھہرا ہوا ہوں''۔

''جی شکریہ''

وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئے اور فرمانے لگے

''اگر کچھ وقت ہو تو مزید کچھ عرض کروں''

''جی' بڑے شوق سے''

''صرف آپ کی اطلاع کے لیے! وہاں امریکن ایڈمنسٹریشن اور امریکن بزنس سرکلز میں میرے اچھے Contacts ہیں۔ ورلڈ بینک کے وائس پریذیڈنٹ میرے ذاتی دوست ہیں' امریکہ کے موجودہ صدر کے دست راست ہیری کاملٹن میری بیوی کے فرینڈ ہیں کیوں کہ دونوں امریکن ہیں۔ میں ان حلقوں میں آپ کے لیے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہوں''

''کیوں نہیں' میری مراد ہے کہ اگر ورلڈ بینک سے مالی امداد یا امریکن ایڈمنسٹریشن سے فوجی امداد چاہیے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''جواباً پاکستان کو آپ کی کیا خدمت کرنی چاہیے۔''

آپ میری Utility دیکھ لیں' جنرل صاحب کو بتا دیں پھر BusinessBer Terms تو Negotiable ہیں''۔

میں نے دوسری مرتبہ ان کا شکریہ ادا کیا تا کہ وہ چلے جائیں لیکن وہ بھی بڑے کائیاں تھے' میری کمزوری بھانپ گئے' کہنے لگے۔

''آپ خاصے Plite مگر Non-Commital لگتے ہیں' معلوم ہوتا ہے اکنلک ایڈ یا ملٹری ایڈ آپ کا شعبہ نہیں''۔

''جی ہاں! آپ ٹھیک سمجھے۔''

''جی' میں پریس سے ڈیل کر سکتا ہوں۔''

''تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا شعبہ کیا ہے'' اور' آئی سی Mass Communication Media' واہ واہ بڑا پاور فل شعبہ ہے' آپ کا' میں نے بزنس میں آنے سے پہلے واشنگٹن یونیورسٹی سے ماس میڈیا میں ڈگری لی تھی' میرے پاس پاکستان کے بارے میں بھی خاصے Suggestions ہیں۔

I trust you have a good Information Secretary or I can offer....

(یقیناً آپ کے پاس ایک اچھا انفارمیشن سیکریٹری ہوگا ورنہ میں ۔۔۔)

میں نے تیسری بار بڑا زوردار شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ صاحب راوی کے پل پر بس میں چڑھ کر میٹھی گولیاں بیچنے والے سے زیادہ مختلف نہیں' البتہ معیار اور طریقہ کار میں تھوڑا فرق ہے۔

چند روز بعد ایک اور صاحب آئے' چہرے مہرے سے خاصے خوشحال' کلین شیو' عمدہ کلون کی خوشبو' منہ میں پائپ' ہاتھ میں تمباکو کا پیکٹ' منہ میں انگریزی' لباس نسبتاً سادہ یعنی بلیو رنگ کی جینز (Jeans) کا سوٹ اور ہاتھ میں سفید کینوس کا چوڑا ہیٹ۔ انہوں نے داخل ہوتے ہی ہیٹ میری میز پر رکھ دیا اور فرمانے لگے۔

''میں پاکستانی ہوں مگر پچھلے تیس سال سے جرمنی میں رہ رہا ہوں' ہمارا ایک Group of Multi-National Companies ہے' جس کے بارہ ڈائریکٹروں میں سے ایک میں ہوں' میں واحد ایشین ہوں اور پاکستان سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔''

''کیسے تشریف لائے''

''ہماری ایک کمپنی ڈرلنگ کا کام کرتی ہے''

''کیا ڈرل کرتی ہے؟''

''ہر چیز' آئل ڈرلنگ سے لے کر واٹر ڈرلنگ تک''

''لیکن پاکستان میں تو پہلے ہی آئل کا کام غیر ملکی کمپنیوں کے تعاون سے اچھی طرح ہو رہا ہے۔ اگر اس سلسلے میں آپ کے پاس کوئی خصوصی Expertise ہے تو آپ کو اقتصادی امور کے ماہر جناب غلام اسحق خان سے بات کرنی ہوگی۔''

''ہمارے پاس Water Diviner بھی ہیں' سنا ہے آپ کے چولستان کا وسیع علاقہ پانی کی کمیابی کی وجہ سے بنجر اور ویران پڑا ہے' اگر آپ اپنے ایگریکلچر کو بوسٹ کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں میٹھے پانی کی نہریں بہا سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہمارے پاس اس مقصد کے لیے خصوصی ٹیکنالوجی بھی موجود ہے۔''

میں ذرا سوچ میں پڑ گیا تو انہوں نے کہا۔

''آپ فوری طور پر بیشک Commit نہ کریں فی الحال Feasibility Report بنوالیں۔''

’’اس پر کتنا خرچ آئے گا‘‘

’’میں آپ کو آف ہینڈ (Off Hand) تو نہیں بتا سکتا‘‘

’’پھر بھی‘‘

’’یہی ڈیڑھ دو ملین ڈالر‘‘

مجھے میٹھا پانی اچانک کڑوا لگنے لگا۔

تیسرے صاحب ذرا مختلف قسم کے تھے‘ وہ مجھ پر وقت ضائع کرنے کی بجائے جنرل ضیاء الحق سے ملنے پر زور دیتے رہے‘ میرے ہر سوال کے جواب میں فرماتے کہ میں انہیں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے وہ مذہبی آدمی ہیں۔ ضرور پسند فرمائیں گے۔‘‘

میں نے عرض کیا کہ’’ میں آپ کی بات اس وقت تک آگے نہیں پہنچا سکتا جب تک آپ مجھے اعتماد میں نہیں لیں گے‘‘

مجبوراً انہوں نے سربستہ رازیوں کھولا۔

’’میرا گھڑیوں کا کاروبار ہے‘ جاپان آج کل اس میدان میں بہت ایڈوانس ہے‘ میں نے جاپان کی ایک کمپنی کے ساتھ مل کر ایک ایسی گھڑی تیار کی ہے جو خود بخود پانچوں وقت اذان دیتی ہے اور اس کی اذان وہی ہے جو خانہ کعبہ میں دی جاتی ہے اور اس کا وقت بھی وہی ہے جو خانہ کعبہ کا ہے یعنی آپ کو یہیں بیٹھے بیٹھے آٹو میٹک الارم کے ذریعے پتہ چل جائے گا کہ خانہ کعبہ میں ظہر کی اذان ہوگئی ہے۔‘‘

’’لیکن اس کا فائدہ؟ ہم نے تو مقامی وقت کے مطابق نماز ادا کرنی ہے‘‘

’’آپ وہ بھی کرسکتے ہیں‘‘

’’کیسے؟‘‘

’’آپ ایک بٹن گھما کر اسے پاکستان کے ٹائم کے مطابق سیٹ کرسکتے ہیں‘‘

’’آپ کا پتہ کیا ہے؟‘‘

’’جی‘ سیالکوٹ شہر کے بابو محلے میں ہماری دوکان ہے‘ رفیق میرا نام ہے‘ دکان کا نام میرے نام پر ہے’’رفیق واچ کمپنی‘‘۔۔۔ اگر آپ مہربانی کرکے یہ پروگرام منظور کروادیں تو ہماری پندرہ بیس ہزار گھڑیاں بک جائیں گی۔ نمونے کی یہ گھڑی آپ کی نذر‘‘

’’نہیں نہیں‘ رفیق صاحب‘ میں کوئی تحفہ قبول نہیں کرسکتا‘‘

''یہ تحفہ تھوڑا ہی ہے' یہ تو کارِ ثواب ہے''

میں نے بڑی مشکل سے تحفہ لوٹایا (کیوں کہ زیادہ قیمتی نہیں تھا)

وہ نکلے تو ٹیلی فون بجا' ایک اجنبی شخص بول رہا تھا' اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کا پڑوسی محمد اسلم بول رہا ہوں''

''میرا پڑوسی؟ میں تو میس میں رہ رہا ہوں''

''نہیں سالک صاحب' سیٹلائٹ ٹاؤن والا پڑوسی''

''جی میں نے پہچانا نہیں''

''جی کوئی بات نہیں' مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں بیٹھنے سے عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔''

''طعنے دینے سے پہلے ذرا ٹھیک سے تعارف تو کروا دیجیے۔''

''جی ضرور' آپ ۱۹۶۳ میں وزارت اطلاعات میں تھے''

''جی تھا''

''آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی''

''جی ہوئی تھی''

''آپ مکان نمبر ۳۲۳۔۔۔ڈی کے اوپر والے پورشن میں رہتے تھے۔''

''بجا فرمایا۔ اور آپ؟''

''میں اسی مکان کے نیچے والے پورشن میں رہتا ہوں''

''لیکن وہاں تو پیرزادہ صاحب رہتے تھے''

''وہ تو ۱۹۶۵ء میں فوت ہو گئے تھے۔ یہ دراصل ہمارا مکان تھا' گورنمنٹ نے لے رکھا تھا' اب ہم نے De-Hire کرالیا ہے لیکن اوپر والا کرایہ دار جو سرکاری افسر ہے' مکان خالی نہیں کرتا''

''جی درخواست بھجوا دیجیے میں کوشش کروں گا''

''جی کوشش نہیں' خالی کروا دیں' آخر پڑوسیوں کا بھی حق ہوتا ہے''

میرے اگلے قابل ذکر ملاقاتی کچھ کچھ مانوس لگتے تھے' انہوں نے دھاری دار میلا سا سوٹ اور اس پر اس سے بھی میلی ٹائی پہن رکھی تھی' اپنی طرف سے انہوں نے شیو بنایا ہوا تھا لیکن لگتا تھا نہیں بنایا' میرے سامنے انہوں نے سگریٹ نہیں پیا لیکن ان کے ہونٹوں کی سیاہی سے یوں نظر آتا تھا کہ وہ سگریٹ بکثرت پیتے ہیں۔ ان کے بال لمبے اور کھچڑی مائل تھے' جیسے بیمار مرغی کی دم ہوتی ہے' ان کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک تھیلا تھا' جس کے ایک کونے میں کسی زرعی کانفرنس کا ذکر تھا' غالباً یہ بیگ انہیں مذکورہ کانفرنس کے موقع پر دیا گیا تھا' بیگ کے کونوں میں میل جما ہوا تھا لیکن پھولے ہوئے درمیانی حصے پر بار بار ہاتھ لگنے سے چمک آ چکی تھی۔ وہ داخل ہوتے ہی بولے۔

''سالک صاحب' آپ نے پہچانا نہیں''

''بس چہرہ تو مانوس ہے' میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔''

انہوں نے بیٹھتے ہوئے فرمایا۔

''میں آپ کی مدد کرتا ہوں' ڈھاکہ میں مارننگ نیوز اخبار کے دفتر کے باہر ملاقات ہوئی تھی' آپ ایڈیٹر صاحب سے ملنے جا رہے تھے اور میں مل کر آ رہا تھا۔۔۔''

میں نے یونہی خیر سگالی کی خاطر ہاں' ہاں کہہ دیا اور ان کی آمد کا مقصد پوچھا' انہوں نے فرمایا کہ وہ کراچی میں رہتے ہیں اور فری لانس رائٹر ہیں' کسی نہ کسی وزارت کے کام سے وزارت ہی کے خرچ پر راولپنڈی اور اسلام آباد آتے رہتے ہیں' اس دفعہ آنا ہوا تو سوچا ڈھاکہ کے پرانے دوست سالک سے مل لوں۔''

''زہے نصیب۔۔۔ میرے لائق کوئی خدمت؟''

''جی کوئی خاص خدمت نہیں' لیکن میں اسے اپنا قومی فریضہ سمجھتا ہوں کہ آپ کے نوٹس میں یہ بات لاؤں کہ سی ایم ایل اے صاحب کی تقریریں خاصی غیر معیاری ہوتی ہیں' ۵ جولائی کی پہلی تقریر میں بھی تلفظ کی غلطیاں تھیں' میں خواجہ ناظم الدین کے دفتر میں Translator کے طور پر کام کر چکا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ صحیح زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے''

''جی' سی ایم ایل اے صاحب کی تقریروں میں بنیادی خامی کی نشاندہی کا شکریہ! لیکن کیا آپ میری اطلاع اور جنرل صاحب کی راہنمائی کے لئے بتا سکیں گے کہ آپ کا یہ تبصرہ ان کی انگریزی تقریروں پر بھی لاگو ہوتا ہے یا صرف اردو کی تقریروں پر''

''دونوں غیر معیاری ہوتی ہیں''

''علاج کیا ہے''

''مجھے جنرل صاحب کا Speech Writer رکھوا دیجیے''

''اردو کا یا انگریزی کا''

''دونوں کا' مجھے دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے' اخباری تراشے ساتھ لایا ہوں۔''

پھر انہوں نے اپنی تحریریں دکھانے کے لئے تھیلا کھولنا شروع کیا۔ انہوں نے مجھے مخمصے میں دیکھ کر خود ہی فرمایا کہ

''میں وقت ضرورت خود ہی انگریزی کی تقریر ٹائپ کر سکتا ہوں اور اردو تقریر کی کتابت بھی کر سکتا ہوں' مجھے دونوں زبانوں میں اللہ تعالیٰ نے بڑا اچھا ہینڈ رائیٹنگ بھی دیا ہے''۔

مجھے یہ شخص مجھ سے بھی زیادہ کوالیفائیڈ لگا' میں نے اپنی نوکری بچانے کے لئے اسے جلد ہی چلتا کیا۔

رفتہ رفتہ میرے ادیب اور صحافی دوستوں تک بھی یہ خبر پہنچ گئی کہ میں مارشل لاء میں پہنچ گیا ہوں' اس کا اندازہ اس طرح ہوا کہ ایک مرتبہ رات کو ایک بجے شراب میں مدہوش ایک شاعر دوست نے کوئٹہ سے فون کیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

''سالک صاحب' مجھے جنرل صاحب کا جہاز بھجوا کر ابھی ابھی کوئٹہ سے منگوا لو ورنہ میری جان خطرے میں ہے''

''کیوں کیا ہوا

''یار' آپ کو تو پتہ ہے' میں یہاں ریسٹ ہاؤس میں رہتا ہوں۔ دن کو سرکاری نوکری کرتا ہوں اور رات کو شاعری''

''لیکن مارشل لاء میں شعر و شاعری پر تو کوئی پابندی نہیں۔۔۔''

''بس یار ہم چار شاعروں کے ساتھ چار خواتین بھی تھیں۔''

''چار تو شرعاً جائز ہیں' 'میں نے مذاق میں کہا جو اس کی سمجھ میں نہ آیا' اس نے پھر اصرار کیا کہ طیارہ فوراً بھجواؤ اور اس وقت بھجواؤ ورنہ تم ایک نہایت عزیز دوست سے محروم ہو جاؤ گے''

''بھئی ہوا کیا ہے''

''یار' تمہیں پتہ تو ہے کہ ایسے موقعوں پر کیا ہوتا ہے' چھاپہ پڑا ہے۔ سب پکڑے گئے ہیں' میں بھاگ کر تمہیں فون کرنے آیا ہوں' لیکن تم ہو کہ سوال زیادہ پوچھ رہے ہو اور کام کی بات کم کر رہے ہو''۔

میں نے کہا کہ ''طیارہ بھجوانا تو مشکل ہے' البتہ اگر صبح تک انتظار کر لو تو میں کل مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کوئٹہ والوں سے بات کروں

گا۔"

"چھڈ یار' اتنا بھی کام نہیں کر سکتے' مارشل لاء میں لگے بیٹھے ہو"

اس کے بعد اس نے غصے سے ٹیلی فون پٹخ دیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد چار پانچ قلمکاروں کا ایک گروہ میرے پاس آیا اور آتے ہی کہنے لگا۔

"آج کل تو تمہارے پاس بہت سے لوگ آتے ہوں گے' کوئی کہتا ہو گا پلاٹ دلوا دو' کوئی مطالبہ کرتا ہو گا سیمنٹ کی ایجنسی الاٹ کرا دو لیکن ہم صرف آپ کی خیریت معلوم کرنے اور اہم قومی مسائل کے بارے میں بات کرنے آئے ہیں"۔

میں نے سرکاری کاغذ سمیٹ کر ایک طرف رکھے' چپڑاسی کو چائے اور سموسے لانے کو کہا اور عرض کیا۔

"آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ملنے کی زحمت گوارا فرمائی' فرمایئے اجتماعی مسائل کیا ہیں؟

انہوں نے فرمایا۔

"ریڈیو اور ٹی وی میں خاص گروپوں کی اجارہ داری ہے' یہ اہم قومی ادارے سرخوں کمین گاہیں بن چکی ہیں اور ہم Rightists کو' جو جنرل ضیاء کی طرح نظریہ اسلام پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی فوج ہیں' بالکل نظر انداز کیا جا رہا ہے"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ انہیں ہٹاؤ اور ہمیں لگاؤ"

"کس کو؟ ضیاء الحق کو یا سرخوں کو؟"

"ظاہر ہے سرخوں کو؟"

"گویا ایک اجارہ داری ختم کر کے دوسری اجارہ داری قائم کر دیں"

"یہ اجارہ داری نہیں ہو گی' یہ تو تخلیق پاکستان کے اصل مقاصد کی طرف اہم پیش رفت ہو گی"۔

"آپ کے پاس کچھ نام ہیں جو آپ کے خیال میں صحیح الذہن اور Competent ہیں اور ان اداروں میں ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہیں۔"

"جی ہم جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں"

"اچھا! اس کے علاوہ کوئی تجویز؟"

"صحیح قسم کے رائٹرز کو غیر ملکی دوروں پر بھیجا جائے"

"کچھ نام ہوں گے آپ کے پاس؟"

جی ہم نام بھی دے دیں گے۔فی الحال ہم پانچوں کے نام لکھ لیں"

"۔۔۔۔اور کچھ؟"

"بس آپ نیشنل پریس ٹرسٹ کو توڑ دیں"

"کیوں؟

"یہ بھی سرخوں کا اڈا بنا ہوا ہے۔"

"اگر اسے توڑنے کی بجائے Rightists کا اڈا بنا دیا جائے تو۔۔۔"

"انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"پھر ٹھیک ہے۔"

اس دوران انہوں نے چائے پی' سموسے کھائے اور مجھے اپنی ملاقات اور تجاویز کا شرف بخش کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی ڈاک کھولی تو اس میں بھی ضرورت مندوں کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا ذکر تھا مثلاً ایک صاحب نے لکھا تھا کہ مجھے ہندوستان جانے کا ویزا دلوا دو' دوسرے نے فرمائش کی تھی مجھے امریکہ بھجوا دو' تیسرے نے تحریر فرمایا تھا کہ میرے نو تعمیر کردہ مکان میں سوئی گیس لگوا دو۔

ان سب خطوں میں ایک خط میرے گاؤں کے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کا تھا' جو میں جوں کا توں درج کر رہا ہوں۔انہوں نے لکھا تھا۔

عزیزم صدیق سالک طولعمر و مدظللہ'

السلام و علیکم و رحمتہ اللہ! گاؤں میں خاصی دھوم ہے' خاص کر چاچا احمد خان اور بابا رمضان بہت خوش ہیں کہ بال آخر تم بہت بڑے افسر بن گئے ہو' وہ سب بجا طور بڑے فخر کرتے ہیں کہ ان کی طرف اور پورے گاؤں کی طرف تم خاص توجہ دو گے لیکن میں تمہیں یہ خط یہ ذاتی مسئلے کے بارے میں لکھ رہا ہوں جو درحقیقت قومی مسئلہ بھی ہے' مجھے امید ہے کہ تم جنرل صاحب سے کہہ کر یہ مسئلہ جلد از جلد حل کروانے کی کوشش کرو گے' مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اپنے بیٹے اسلم کو میٹرک پاس کروایا لیکن مناسب نوکری نہ مل سکی' اسے

باہر بھجوانے کی کوشش کی لیکن ایجنٹ دس ہزار روپے کھا گیا' پھر اسے مرغی خانہ کھول دیا' تو ایک وبائی بیماری کی وجہ سے ایک ایک کر کے ساری مرغیاں مر گئیں' میں نے گاؤں والوں کی پچھلے دس برسوں سے خدمت کی ہے لیکن انہوں نے میری ذرہ بھر مدد نہیں کی' حتیٰ کہ انہوں نے بیمار مرغیاں آدھی قیمت پر بھی خریدنے سے انکار کر دیا' اب تمہاری طرف اصلاح احوال کے لیے رجوع کر رہا ہوں لہٰذا بلاتاخیر حسب ذیل کام کرو۔

(ا) ملک سے فوراً بے روزگاری ختم کراؤ اور اسلم کو کوئی اچھی سی نوکری دلاؤ۔

(ب) اس قوم کو ایجنٹوں سے نجات دلاؤ اور میرا ڈوبا ہوا پیسہ واپس دلاؤ۔

(ج) اس ملک کی معیشت کو بچانے کے لئے مرغیوں کو وبائی بیماریوں سے بچاؤ اور جن لوگوں کی حلال کمائی حرام موت مرنے والی مرغیوں پر ضائع ہو چکی ہے اس کی تلافی کراؤ۔

باقی قومی مسائل کے بارے میں پھر عرض کروں گا۔

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

◆◆◆

کتاب عمر کا اک اور باب ختم ہوا

۳۰ جون ۱۹۸۵ء کو بریگیڈئر تفضل حسین صدیقی ریٹائر ہوئے' تو مجھے آئی ایس پی آر کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا' یوں کوئی آٹھ سال کی صحرا نوردی کے بعد مجھے لیلائے فوج سے دوبارہ وصل کی گھڑی نصیب ہوئی۔ ان آٹھ برسوں میں مجھے یوں محسوس ہوتا رہا کہ میں ایک کھلنڈرے لڑکے کی طرح صبح گھر سے نکلا ہوا ہوں اور پیچھے میری ماں مجھے صدائیں دے رہی ہے کہ بیٹا شام کو جھٹ پٹے سے پہلے پہلے گھر واپس آ جانا' تم پہلے بھی ایک مرتبہ مارشل کے نہاں خانوں اور کسی اور کے بندی خانوں میں کھو گئے تھے اور میں تمہیں دو سال ڈھونڈتی رہی تھی' اب وہ ساعت کرب دوبارہ نہ دینا' اپنا دامن سنبھال کر رکھنا اور صحیح و سالم جیسا بھیجا تھا' ویسا ہی واپس میری دہلیز پر آ جانا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اپنے عسکری جزیرے میں صحیح و سالم واپس آ گیا۔

جب میں دوبارہ اپنے میکے (آئی ایس پی آر) تو اس وقت ملکی ماحول بھی میری طرح آدھا فوجی اور آدھا سویلین تھا یعنی جس طرح وردی پہننے سے مجھ میں عسکریت تو آ گئی تھی لیکن سویلین سوچ مفقود نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح میں بھی جمہوریت تو آ چکی تھی لیکن مارشل لاء ہنوز الوداع نہیں ہوا تھا۔

میری غیر حاضری میں آئی ایس پی آر کی حالت پہلے سے بھی ابتر ہو چکی تھی' عمارت پہلے سے زیادہ بوسیدہ ہو چکی تھی' اکثر گتے سیلنگ (Ceiling) سے گر چکے تھے اور جو باقی تھے ان میں بلیوں اور کبوتروں کی نئی نسل آباد ہو چکی تھی۔ بجلی کے تار بیوہ کے آنسوؤں کی لڑی کی طرح' جگہ جگہ لٹک رہے تھے' کہیں کہیں فوٹو نیگیٹو (Negatives) نالیوں میں بہہ رہے تھے اور بعض تاریخی اخبارات دیمک کی خوراک بن چکے تھے۔ خاکستر کی اس ڈھیری کے اوپر ڈائریکٹر کی کرسی پر بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ میں اس دیرینہ ادارے کا کیا کروں' مجھے وہ دن بھی یاد آیا جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور ادارے کو اپنے خوابوں کے جزیرے کا ایک زینہ جانا تھا' پھر باری باری وہ ڈی پی آر یاد آئے جو مجھ سے پہلے اس کرسی پر رونق افروز رہ چکے تھے' وہ سارے بڑے لائق اور باوسیلہ لوگ تھے' میرے دل میں ان کے لئے بڑی قدر و منزلت تھی (اور ہے) لیکن میں حیران تھا کہ انہوں نے ادارے کی حالت زار پر کیوں توجہ نہ دی' میں نے سوچ کے پرندے کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ ان کی توجہ کام پر زیادہ رہی ہو گی اور ظاہری زیب و زینت پر کم جب کہ میری ترجیحات ذرا مختلف ہیں کیوں کہ میں مارشل لاء کے دوران بہتر دفتری آسائشیں دیکھ چکا ہوں' گویا بگاڑ ڈائریکٹریٹ میں

نہیں، میرے اندر ہے۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ کہ جنرل ضیاء الحق جو چیف آف دی آرمی سٹاف، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت کی تین ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے، اچانک تشریف لے آئے۔ انہوں نے آتے ہی فرمایا۔

''میں ادھر جی ایچ کیو آیا تھا۔ سوچا جاتے ہوئے تمہیں ملتا جاؤں اور وہ ایمپائر بھی دیکھتا چلوں جسے کمانڈ کرنے کا تمہیں بہت شوق تھا''

عرض کیا۔ فوج کی ایک روایت ہے (اور آپ اس روایت کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں) کہ انسان جس یونٹ میں کمشن پا کر پہلی مرتبہ جاتا ہے، اسے ایک نہ ایک دن کمانڈ کرنے کی تمنا بھی رکھتا ہے، مجھ پر بھی اس روایت کا اثر ہو گیا تھا اور میرے اندر بھی ایک ایسی ہی معصوم تمنا جاگ اٹھی تھی''

انہوں نے فرمایا

''یہ ایک قدرتی تمنا تھی جسے پورا کر دیا گیا ہے۔ لیکن اب بتاؤ اس ادارے کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟

''مجھے یہاں آئے آج تیسرا دن ہے، اس قلیل عرصے میں، میں اسے سنوارنے یا بگاڑنے کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔''

''پہلے لوگ یہاں کیا کرتے رہے ہیں؟''

''غالباً وسائل کی کمی حائل تھی''

''کیا چاہیئے؟''

اب تین ٹوپیاں پہننے والے بااختیار شخص کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کس کے منہ سے رال نہیں ٹپکے گی لیکن میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور دماغ کی کھڑکیاں کھول دیں، جھٹ غالب کا شعر در آیا۔

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

وہ چلے گئے

دو دن بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل خالد محمود عارف آئی ایس پی آر تشریف لائے۔ وہ سی ایم ایل سیکریٹریٹ میں بطور چیف آف سٹاف میرے پاس رہ چکے تھے۔ شعر و ادب کے حوالے سے ہمارا باہمی تعلق اگرچہ دوستی کا

تھا' لیکن یہاں تو وہ سرکاری ٹھاٹ باٹھ کے ساتھ آئے تھے یعنی آگے آگے ملٹری پولیس پیچھے لمبی چمکیلی کار' جس کے آگے اور پیچھے چار چار سٹار چمک رہے تھے' اوپر ڈنڈا اور ڈنڈے کے اوپر جھنڈا۔ میں نے باہر نکل کر فوجی آداب کے مطابق انہیں خوش آمدید کہا' اپنے رفقاء کو فالن کرا کے ان کا تعارف کرایا' ڈائریکٹریٹ کا دورہ کرایا اور دفتر میں بٹھا کر۔۔ چارٹوں کی مدد سے۔۔ انہیں ڈائریکٹریٹ کے ماضی اور حال سے آگاہ کیا' انہوں نے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو عرض کیا کہ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً ڈائریکٹریٹ کی ظاہری حالت بدلی جا سکتی ہے۔ افسروں کی کمی پوری کی جا سکتی ہے' اس کی کارکردگی بہتر بنائی جا سکتی ہے وغیرہ۔

جنرل عارف کی عادت ہے کہ وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں' لہٰذا وہ سنتے ہے اور غالباً ساتھ ہی ساتھ سوچتے بھی رہے۔ چائے کی پیالی پینے کے بعد اٹھے اور صرف یہ کہہ کر چل دیئے کہ

We will do some thing about it.

(یعنی ہم اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کریں گے)

وہ دل ہی دل میں پتہ نہیں کیا کچھ دے گئے اور میں یہ سوچتا رہ گیا کہ

یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

جنرل عارف کی سوچ اس بم کی مانند ہوتی ہے جو پہلے تو خاموشی سے سیدھا پندرہ بیس فٹ زمین کے اندر چلا جاتا ہے اور پھر پھٹتا ہے اور جب پھٹتا ہے تو نہ صرف زمین کے متعلقہ حصے کو زیروزبر کر دیتا ہے بلکہ دور دور تک اس کی تھرتھراہٹ بھی محسوس کی جاتی ہے۔ چنانچہ جنرل عارف کے سرکاری دورے کے چند ہی روز بعد ملٹری انجینئرنگ سروس (ایم ای ایس) کا عملہ ٹھیکیدار سمیت آ گیا' انہوں نے میری ضروریات پوچھیں اور ان کے مطابق کام شروع کر دیا' نہایت ہی قلیل عرصے میں انہوں نے میرے لیے دو کمروں کا ایک نیا ایڈمنسٹریٹو بلاک تعمیر کر دیا۔ گارے کی پرانی دیواروں کو سہارا دینے کے لیے ان کے ساتھ لوہے کے جنگلے تھما کر اوپر سے سیمنٹ چپکا دیا۔ متاثرہ حصوں کی وائرنگ بدل دی اور لٹکے ہوئے گتے اتار کے نئی سیلنگ لگا دی' پھر ساری عمارت کو رنگ و روغن سے یوں چمکا دیا' جیسے پچاس سالہ حسینہ بیوٹی پارلر سے بن سنور کر نکلتی ہے اب ماشاءاللہ وہاں پھول کھلتے ہیں' سبزہ لہراتا ہے' مہمان آتے ہیں' احباب خوش ہوتے ہیں اور تھڑ دلے حسد کرتے ہیں۔

میں ذاتی تجربے کی بنا پر بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ظاہری زیب و زینت یا Face Lifting سے میری صحت کے علاوہ ڈائریکٹریٹ کی صحت پر بھی بڑا خوشگوار اثر پڑا ہے۔

آئی ایس پی آر میں اس ظاہری تبدیلی کے علاوہ میں نے اس کے اندر بھی ایک تبدیلی محسوس کی اور وہ یہ کہ میں تو بیس بائیس برس پہلے ڈائریکٹر صاحب کے سامنے کانپ کانپ کر یہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید ماتحت لوگوں کا یہ بنیادی فرض ہے اور اب جب کہ میں ڈائریکٹر بنا ہوں تو میرے سامنے دوسروں کے کانپنے کی باری ہے لیکن کرسی پر بیٹھنے پر انکشاف ہوا کہ فوج میں رینک کی دہشت ختم ہو چکی ہے لوگ بے دھڑک آگے بڑھتے ہیں' اعتماد کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں' افسران بالا تحمل سے بات سنتے ہیں' عقل سے فیصلے دیتے ہیں اور انگریزی کا بھی کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔

رینک کی دہشت ختم ہونے کا آئی ایس پی آر میں یہ اثر نظر آیا کہ ڈسپلن کریک ہو گیا' لوگ مرضی سے آتے اور مرضی سے جاتے ہیں۔ پہلے چھتوں میں بلیاں دوڑتی تھیں اب ڈی پی آر کے دفتر کے صوفے پر چپڑاسی سوتے ہیں اور تاش کھیلتے ہیں' بعض لوگ وہیں ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور رزق حلال کمانے کے لئے دفتر اوقات میں گھڑیاں مرمت کرتے ہیں' میں نے اسے ذرا کسنے (Tune Up) کے لئے کچھ عرصہ کے لئے اپنا مارشل لائی انداز برقرار رکھا تا کہ سب کو احساس ہو جائے کہ نیا باس بڑا سخت ہے۔ میری اس ایکٹنگ کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور لوگ سمجھنے لگے کہ نئے ڈائریکٹر صاحب ڈسپلن کے بڑے سخت ہیں' پابندی وقت پر زور دیتے ہیں' ساڑھے سات بجے کا مطلب سات بج کر ۲۵ منٹ سمجھتے ہیں' دفتر وقت پر کھلواتے ہیں اور سارا دن کام کرواتے ہیں۔ اور دفتر میں بلا وجہ شور ہو تو خفا ہوتے ہیں اور گاڑیوں کے بیجا استعمال پر سخت سرزنش کرتے ہیں (خود بعض اوقات کپتانی والی حرکت کر جاتے ہیں)۔

میں نے یہ خوفناک امیج بڑی محنت سے بنایا اور اس سے ادارے کا گراف خاصا اوپر چلا گیا اور میری ذاتی مقبولیت کا گراف خاصا گر گیا۔

ایک دن ہمارے دفتر کا ایک فوٹو گرافر عبدالشکور ایک حادثے کا شکار ہو گیا وہ بہت اچھا فوٹو گرافر اور بہت ہی نفیس انسان تھا' دو بجے چھٹی ہوئی اور وہ بچیوں کو سکول سے لے کر سائیکل پر گھر جاتے ہوئے ایک ویگن کے نیچے آ گیا۔ مجھے کوئی نصف گھنٹہ بعد گھر پر اطلاع ملی' بہت دکھ ہوا' جو کچھ انسانی اور سرکاری سطح پر ہو سکا کیا' لیکن اس گوہر نایاب کو دوبارہ دنیا میں لانا ممکن نہ تھا' لہٰذا ہم دیگر پسماندگان کی طرح صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے۔ چند روز بعد ایک رفیق کار کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا' جس کے اوپر لکھا تھا ''ذاتی''میں نے خط کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

محترم ڈی پی آر صاحب

السلام وعلیکم! آپ یہاں ایک سخت گیر باس سمجھے جاتے ہیں لیکن شکور صاحب کی حالیہ وفات پر آپ کے رویے نے آپ کے تمام دشمنوں اور حاسدوں کے منہ بند کر دیئے ہیں۔ آپ حادثے کی خبر ملتے ہی جس طرح شلوار کرتے اور سلیپروں میں ہسپتال پہنچے' جس طرح آپ نے ڈاکٹروں کا پیچھا کر کے زخمیوں کو بروقت طبی امداد پہنچائی اور جس طرح آپ مرحوم کی تجہیز و تکفین کے مراحل سے لے کر لواحقین کو حوصلہ دینے تک سارا دن اور ساری رات سوگوار کھڑے رہے' وہ یقیناً ایک دردمند انسان اور ایک رحمدل باس کی غمازی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس نیکی کی آپ کو جزا دے۔

میں نے اس پر لکھا:

مکرمی! خط کا شکریہ' میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا' جس کسی کو میرے ہمدردانہ رویے کے متعلق ذرا بھی شک ہو تو وہ مر کر دیکھ لے' اس کے ساتھ شکور اور اس کے لواحقین سے بھی بہتر سلوک کیا جائے گا۔ اس کے بعد آج تک مجھے کسی نے نہیں آزمایا۔

اس خوشی و غمی اور گرمی و سردی میں میری ڈائریکٹری اور ڈائریکٹریٹ تو چل نکلی لیکن میرا اصل کام وہ تھا جس کا میں نے شروع کے ابواب میں ذکر کیا تھا یعنی عوام اور افواج کے درمیان باہمی اتحاد کا ایسا رشتہ قائم کرنا۔۔ اور اسے استوار بنانا۔ کہ اہل وطن کو یہ اعتماد ہو کہ وطن مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ اور افواج کو یہ یقین ہو کہ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں پوری قوم ان کے ساتھ ہے۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ آیا ۱۹۸۰ء کی رہائی میں باہمی اعتماد کی یہ فضا قائم تھی یا نہیں؟ اور اگر نہیں تو اسے کس طرح قائم کیا جا سکتا تھا۔

سب سے پہلے میں نے فوج کے اندر نگاہ ڈالی' مختلف چھاؤنیوں میں گیا' افسروں اور سپاہیوں سے ملا' ان سے تبادلہ خیال کیا' ان کا رہن سہن دیکھا' ان کی سوچ پڑھی' ان کے نظریات سنے' ان کے خوابوں میں شریک ہوا اور ان کے دل کے پھپھولے دیکھے' میں نے محسوس کیا کہ پچھلے پچیس برسوں' خاص کر گزشتہ دس بارہ برسوں میں' فوج میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی ہے جو در حقیقت دل و دماغ کی تبدیلی ہے اور اس کے کچھ مظاہر توجہ طلب ہیں مثلاً اب اکثر و بیشتر فوجی جن میں فوجی افسر پیش پیش ہیں' دفتری اوقات کے بعد شلوار کرتا پہنتے ہیں اور نماز کے لیے جیبی ٹوپی ساتھ رکھ سکتے ہیں' حالانکہ جب میں فوج میں آیا تھا تو کوئی فوجی آفیسر گاؤن پہنے بغیر شلوار کرتے میں اپنے گھر میں مہمان کے سامنے نہیں آ سکتا تھا' اس وقت نماز پڑھنے والے اکا دکا ہوتے تھے جو چھپ چھپا کر یہ فریضہ ادا کرتے تھے تا کہ موڈرن سوسائٹی کے تمسخر کا نشانہ نہ بنیں۔ اب نماز کا وقت آ جائے اور کوئی نماز نہ پڑھے تو وہ منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ کہیں تمسخر کا نشانہ نہ بنے۔

پہلے فوجی افسر چھٹی لے کر یورپ اور امریکہ جاتے تھے اور واپسی پر رنگین داستانوں کے کئی دیوان ساتھ لاتے تھے' اب باقاعدگی کے ساتھ حج اور عمرے پر جاتے ہیں' واپس پر کھجوریں' تسبیحاں' اور مصلے اور ٹوپیاں لاتے ہیں اور خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر واردات قلبی سنا کر اپنے ساتھیوں کے ایمان کو تازہ کرتے ہیں۔

نماز روزے کے علاوہ ان کی بود و باش ہی بدل چکی ہے' اب ان کی اقدار پاکستانی اور اسلامی ہیں' آزادی کے بعد' انگریز کی تقلید میں' فوجیوں نے اپنے اوپر' مصنوعی آب وتاب کا جو خول پہن رکھا تھا' وہ اب اتر چکا ہے اور اب وہ' اپنے اصلی روپ میں ایک سچے پاکستانی اور پکے مسلمان کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ آج فوج آسمانی فرشتوں کی فوج بن چکی ہے۔ اب بھی اس میں کالی بھیڑیں ہوں گی (کس شعبے میں نہیں ہوتیں) لیکن اس ریوڑ کا مجموعی رنگ کالا نہیں صاف سفید ہے۔

اس کے علاوہ میں نے اس کی پیشہ وارانہ مہارت کو بھی قریب سے دیکھا اور تنقیدی نگاہ سے پرکھا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے اکثر دفاعی نظریات آج بھی مغربی سوچ کی چھاپ رکھتے ہیں اور افواج پاکستان کا تنظیمی ڈھانچہ بھی بنیادی طور پر وہی ہے جو ۱۹۴۷ء میں ہمیں ورثے میں ملا تھا لیکن اس فریم ورک کے اندر بے پناہ تبدیلیاں آئی ہیں اور یہ تبدیلیاں مثبت نوعیت کی ہیں' فوجی افسر اپنے پیشہ ورانہ کورسز بکثرت کرتے ہیں اور رہی سہی کسر ذاتی مطالعے سے پوری کرتے ہیں اور اپنے مطالعے اور سوچ کے نتائج کی روشنی میں ملکی دفاع اور اس کے مسائل پر غور کرتے ہیں۔ میں نے کئی پیشہ ورانہ بحثیں سنی ہیں اور مجھے اس کی خالص عسکری سوچ سے استفادہ کر کے ہمیشہ تقویت ملی ہے۔

مجھے مزید تقویت ۱۹۸۷ء کے موسم سرما میں ملی جب بھارت نے ایک وسیع جنگی مشق (Brasstacks) کے نام پر ہماری مشرقی سرحدوں پر جنگ کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کشیدگی کے اس ماحول میں' میں نے پنجاب کی سرحد کے ساتھ متعین اپنے افسروں اور جوانوں کے ساتھ چند روز بسر کیے اور انہیں نغمہ دفاع چھیڑنے کے لئے ستار کے تاروں کی طرح تنا ہوا پایا' باد صرصر کا ہلکا اشارہ ان کی دفاعی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دے رہا تھا۔

جنگی تیاری کا یہ معیار راتوں رات حاصل نہیں ہو سکتا' اس کے لیے طویل راتیں اور طویل تر دن صرف کرنے پڑتے ہیں اور متعلقہ لوگوں نے ایسا کیا تھا' جس کے نتیجے میں آج ہماری دفاعی تلوار کی دھار اتنی تیز ہے کہ بڑے سے بڑے جارحیت پسند کے گھمنڈ کو خاک میں ملا سکتی ہے۔

مجھے لاہور' سیالکوٹ اور چھمب کے علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے ۱۹۶۵ء کے واقعات یاد آ گئے جب میں ایک نوجوان کیپٹن کے

طور پر، کبھی تنہا اور کبھی غیر ملکی اخبار نویسوں سمیت، ان کارزاروں کی خاک پھانکتا رہا تھا، آج میں بر رنگ دگر ان کھیتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ سردیوں کی چمکیلی دھوپ میں گندم کی شاداب فصل کھڑی تھی، سرسوں کے پھول لہلہا رہے تھے اور ان کی رکھوالی کرنے والے ٹینک توپیں اور آہنی خود پہنے سپاہی اپنی اپنی جگہ پر تیار کھڑے تھے، ان کے ساتھ چند ساعتیں گزار کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ آج اگر سوچ کی کرنیں اتنی مرصع اور پھولوں کے پیرہن اتنے گلنار ہیں، تو اس میں ان جیالوں کے خون پسینے کا بہت دخل ہے۔ جو آج بھی ۱۹۶۵ء کے جیالوں کی طرح وطن عزیز کے جیالوں کی طرح وطن عزیز کا قرض چکانے کو تیار بیٹھے ہیں۔

مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ جس فوج کا کردار اتنا بے داغ اور جس کا پیشہ ورانہ معیار اتنا بلند ہو وہ اہل وطن کی آنکھوں کا تارا بننے کی بجائے ان کی نگاہوں میں کھٹکتی کیوں ہے۔ چنانچہ اس نکتے کی تحقیق کے لئے مختلف مکاتب فکر سے ملا اور یہ جان کو طمانیت ملی کہ پاکستانی عوام کی بھاری اکثریت اپنی افواج کے لئے دلی عقیدت اور احترام کے جذبات رکھتی ہے اور صرف چند لوگ ہیں جو کمین گاہوں میں بیٹھے تیر اندازی کرتے رہتے ہیں تا کہ باہمی احترام کی یہ چادر چھلنی ہو جائے اور وہ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جائیں۔

میں خاص طور پر ان لوگوں کے پاس گیا جو ہر خاکی پوش کو بالعموم اور ہر فوجی جرنیل کو کشتنی سمجھتے ہیں۔ میں نے ان کی ہر گفتنی نا گفتنی بات سنی، ان کا ہر حرف ملامت سہا، ہر تیر دشنام برداشت کیا اور یہ جان کر دکھ ہوا کہ وہ محض تعصب کی خاطر وطن کی دفاعی فصیل کو زنداں سمجھے بیٹھے ہیں، میرا جی چاہا کہ چند ماہ کے لیے انہیں اپنے مشرقی یا شمالی جانب نظریاتی تربیت کے لئے بھیج دیا جائے تا کہ ان پر اپنی جنگ گم گشتہ کی حقیقت آشکار ہو سکے۔

میں نے جب انہیں بتایا کہ یہ فوجی ہی ہیں جو سیاچن گلیشیئر کی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر اور سندھ کے ۱۲۲ ڈگری فارن ہائٹ کے ٹمپریچر میں دفاع وطن کی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں اور یہ فوجی ہی ہیں جو اوجھڑی کیمپ (راولپنڈی) سے خطرناک بموں کو بچوں کی طرح گود میں اٹھا کر اپنے ہم وطنوں کی جان و مال کو محفوظ بناتے ہیں تو انہوں نے فرمایا۔

''اسی کی تو انہیں تنخواہ ملتی ہے۔''

عرض کیا ''کیا وہ اپنے کسی عزیز کو اس تنخواہ یا اس سے دس گنا تنخواہ پر یہ خطرناک کام سونپنے پر تیار ہوں گے؟''

وہ خاموش ہو گئے۔

میرا یہ پوچھنے کو بھی جی چاہا کہ جس قوم کے رہبر رہزن اور اس کے معمار اس کے گورکن بن جائیں، اسے دوسروں پر انگلیاں

اٹھانے کا لائسنس کیسے مل جاتا ہے۔

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

میرا ذاتی خیال ہے کہ افواج پاکستان پر جن حلقوں سے بھی تھوڑی بہت تنقید سننے میں آتی ہے اس کی وجہ ان کے ذاتی کردار پر کوئی داغ دھبہ یا ان کے پیشہ ورانہ معیار کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں بلکہ بار بار مارشل لاء کا لگنا ہے کیوں کہ جو بھی اقتدار کی جنگ میں شامل ہوتا ہے' لامحالہ طور پر تیر اندازوں کا ہدف بنتا ہے' بس افسوس صرف اس بات کا ہے کہ چند افراد کے اعمال پورے ادارے کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

میں تو پھر بھی سپاہیوں کے ڈسپلن اور حب الوطنی کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس شہر سنگ میں بھی اپنی عزت نفس کا بلور سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور وہ حکم ملتے ہی دشنام طرازوں سمیت تمام اہل وطن کی حفاظت اور خدمت کے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں' جس طرح ابر رحمت ایمان والوں اور گنہگاروں میں تفریق نہیں کرتا' اس طرح یہ اپنی قومی ذمہ داریاں پوری کرنے میں اپنے حدی خوانوں اور دشنام طرازوں میں امتیاز نہیں کرتے۔

مجھے ان ہی دشوار حالات میں ڈائریکٹر آئی ایس پی آر کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانا پڑیں۔ مجھے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے سنگ ریزوں کو لعل وجواہر اور کانٹوں کو گل گلزار میں بدل دیا' البتہ یہ اطمینان ضرور ہے کہ مقدور بھر مخلصانہ کوشش کی ہے' پٹی ہوئی راہ سے ذرا ہٹ کر کام کیا اور کشتگان شب کو ایک صبح نو کے آثار کی نوید سنائی ہے' جامۂ صد چاک کو کلی طور پر رفو کرنا دس بارہ افسروں پر مشتمل اس ادارے کے بس کی بات نہیں' ویسے بھی پی آر والے سرجن نہیں بیوٹیشن (Beautician) ہوتے ہیں۔ وہ سرجری کر کے ناک نقشہ نہیں بدل سکتے صرف کاسمیٹکس کی مدد سے چہرے مہرے کو جاذب بنا سکتے ہیں' دوسرے الفاظ میں وہ معمار نہیں مزدور ہوتے ہیں جو دیئے گئے نقشے کے مطابق اینٹ اور گارا لگاتے رہتے ہیں' اصل کام تو اکابرین قوم کا ہے کہ وہ ان مزدوروں سے محل تعمیر کروانا چاہتے ہیں یا مقبرہ؟ اگر فوج اور قوم کے درمیان ہم آہنگی اور باہم احترام قائم رہا تو محل تعمیر ہوگا اور ان کے درمیان نفاق کی دیوار کھڑی کر دی گئی تو نعوذ باللہ مقبرہ بن جائے گا۔ فیصلہ اے چارہ گر تیرے ہاتھوں میں ہے!

ذاتی طور پر میں فوج کا از حد ممنون ہوں کہ اس نے پروفیسر حمید احمد خان کے تصوراتی جزیرے کی تلاش ناکام کے بعد مجھے اپنے زیر سایہ زندگی کے پچیس سال عزت واحترام اور نسبتاً آرام اور سکون کے ساتھ بسر کرنے کا موقع دیا' میں نے تو فوج کو ایک زندگی دی

ہے'فوج نے ہزاروں زندگیاں نگار وطن کی نذر کی ہیں۔میں زنداں میں رہا یا مارشل لاء میں' نگار وطن ہی کے رخ زیبا سے روشنی لیتا اور اس کے رخ روشن سے اپنی تاریک راتوں کو منور کرتا رہا۔اب وقت رخصت قریب ہے۔

فیض نہ ہم یوسف' نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا' کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

◆◆◆